نگار

قیمت فی کاپی ۱۰ر

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی
انجیلِ انسانیت

"من و یزداں"

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دورِ تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ۔ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو "انسانیتِ کبریٰ و اخوتِ عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دیگئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقاید، رسالت کے مفہوم اور صحایف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔

ضخامت ۶۷۲ صفحات۔ مجلد۔ سات روپیہ آٹھ آنے (بعہ)
علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات
یعنی

من و یزداں کا دوسرا حصّہ

اس حصّہ میں جن مسایل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے انکی مختصر فہرست یہ ہے:- اصحاب کہف ۔ معجزہ و کرامت ۔ انسان مجبور ہے یا مختار ۔ مذہب و عقل ۔ طوفان نوح ۔ خضر کی حقیقت ۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں ۔ یونس در دہان ماہی ۔ حسن یوسف کی داستان ۔ قارون ۔ سامری ۔ علم غیب ۔ دعاد توبہ ۔ لقمان ۔ عالم برزخ ۔ یاجوج ماجوج ۔ ہاروت ماروت ۔ حوض کوثر ۔ امام مہدی ۔ نور محمدی اور پل صراط ۔ آتش نمرود وغیرہ

ضخامت ۴۲۴ صفحات ۔ کاغذ سفید دبیز۔
قیمت علاوہ محصول پانچر روپیہ آٹھ آنے

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے و ادبی مقالات اسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔
قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان قدرتِ بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئیگا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے
قیمت چار روپیہ علاوہ محصول۔

حسن کی عیاریاں
اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا
شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن
قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

میرا گرمی کا ساتھی

ساتھی وہ ہے جو مصیبت میں خطرہ میں اور بیماری میں آدمی کا ساتھ دے اور اسے ان سے بچائے
روح افزا بھی گرمی کے موسم کی ہر تکلیف میں ۴۰ سال سے انسان کا سچا ساتھی ہونے کا ثبوت دے
رہا ہے روح افزا اندر سے جسم میں ٹھنڈک ڈال کر آدمی کو سارے دن چاق چوبند رکھتا ہے قیمتی دواؤں
لذیذ پھلوں اور مہکتے پھولوں سے جدید سائنٹی فک طریقوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ دو روپے آٹھ آنے کی بوتل

رسالہ ہمدرد گرما جس میں گرمی کے موسم کے ہر مرض کا آسان علاج درج ہے
اللہ مفت طلب فرمائیے

روح افزا

دوا اور ایسی مزے دار

ہمدرد دواخانہ لیبارٹریز دہلی

ہر جگہ ملتا ہے

زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھا کہئے

مرزا غالب نے یہ مصرع بادشاہ کے ہاتھ میں
چکنی ڈلی دیکھ کر کہا تھا مگر دُنیا آج کل اسے

نکٹائی مارکہ

بال استعمال کر کے پڑھتی ہے

ہر قسم کا زردہ، مشکی قوام، دانہ الائچی، تیل، عطر، عرق کیوڑہ و گلاب اور مختلف قسم
کے پان مسالوں کو مشرقی نفاست اور طبی احتیاط کے ساتھ طیار کرنے والا
مشرقی ہندوستان کا قدیم ترین کارخانہ آپ کی فرمائشات کا منتظر ہے۔

فہرست طلب فرمائیے

ٹیلی گرام :- "مشکی قوام ہوڑہ"

ٹیلی فون :- "ہوڑہ ۴۵۵"

نکٹائی برانڈ زردہ فیکٹری - ۱۴۱ ہوڑہ روڈ ہوڑہ

دی مغل لائن لمیٹڈ

(سب سے پرانی ہندوستانی جہازی کمپنی)

مغل لاین نہایت مسرت کے ساتھ رمضان المبارک کے بعد حاجیوں کے پہلے جہاز کی روانگی کا اعلان کرتی ہے

ایس - ایس "خسرو" - وزن ۴۴۰۴ ٹن

بمبئی سے یکم اگست ۱۹۴۹ء کو روانہ ہوگا

کرایہ جہاز (خوراک کے ساتھ)

بمبئی تا جدہ اور واپسی

درجۂ اول -/۱۱۰۵ روپئے

عرشہ (ڈیک) -/۳۹۸ روپئے

ان کرایوں میں قرنطینہ، کامران کی فیس، حفظانِ صحت جدہ کے محاصل اور کشتی کا کرایہ، جن کی مجموعی رقم ۴۰ روپے بارہ آنے ہوتی ہے شامل نہیں ہے۔

عازمین حج کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس وقت تک اپنے گھروں سے روانہ نہ ہوں جب تک کہ کمپنی انھیں بمبئی آنے کے لئے نہ لکھئے، اس لئے کہ امسال حاجیوں کو لے جانے والے جہازوں میں تمام نشستیں محفوظ کی جا چکی ہیں، حاجیوں کو ان کے اپنے مفاد کے پیش نظر مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ ہیضہ اور چیچک کے ٹیکے اپنے وطن ہی میں لگوالیں اور اپنے ہاں کے محکمۂ صحت کے سرکاری افسر سے انٹرنیشنل فارموں پر ان کی تصدیق کرالیں۔

کوئی پیشگی رقم اس وقت تک روانہ نہ کی جائے

جب تک کہ کمپنی اس کے بھیجنے کی درخواست نہ کرے

ٹرنر مارسین اینڈ کمپنی لمیٹڈ مینجنگ ایجنٹس

دی مغل لائن لمیٹڈ ۱۶- بنک اسٹریٹ

فورٹ - بمبئی ۱

رعایتی اعلان

(۱) شہوانیات مکتوبات سوم مالہ وماعلیہ

چار روپیہ چار روپیہ دو روپیہ

گوہر مذہب مجموعۂ استفسار جلد سوم

ایک روپیہ ایک روپیہ تین روپیہ

ان کتابوں کی قیمت علاوہ محصول پندرہ روپیہ ہوتی ہے لیکن اگر آپ سب ایک ساتھ طلب فرمائیں گے تو معہ محصول صرف بارہ روپیہ لئے جائینگے

(۲) ماجدولین نمبر - رومان وافسانہ کی دُنیا کا بہترین شاہکار

قیمت ڈیڑھ روپیہ

فسانہ نمبر - بہترین فسانوں کا انتخاب - قیمت دو روپیہ -

پاکستان نمبر - جو نگار کا جوبلی نمبر بھی ہے - اڈیٹر نگار کے علمی و تاریخی مضامین کا بیش بہا مجموعہ ہے - قیمت تین روپیہ

یہ تینوں خاص نمبر یکجا طلب کرنے پر معہ محصول پانچ روپیہ مل سکتے ہیں

(۳) من ویزداں شہوانیات گوہر

سات روپیہ آٹھ آنہ چار روپیہ ایک روپیہ

مکتوبات نیاز حصۂ سوم مالہ وماعلیہ قول فیصل

چار روپیہ دو روپیہ دو روپیہ

جن کی مجموعی قیمت بیس روپیہ آٹھ آنے ہوتی ہے ایک ساتھ طلب کرنے پر صرف اٹھارہ روپیہ میں معہ محصول -

(۴) مذہب ملک خطا کے شہزادے

ایک روپیہ بارہ آنے

فراست الید حکمار قدیم شہاب

ایک روپیہ ایک روپیہ آٹھ آنہ ایک روپیہ آٹھ آنہ

سب یکجا طلب کرنے پر معہ محصول چار روپیہ

منیجر نگار لکھنؤ

"نگار" کا آیندہ سالنامہ

جو جنوری ۱۹۵۰ء میں شایع ہوگا

جنوری ۱۹۵۰ء میں نگار کی عمر پوری ۲۹ سال کی ہو جائیگی اور اس زمانہ میں اس نے جتنی علمی و ادبی خدمات انجام دی ہیں ان کا جایزہ مختلف پہلوؤں سے لیا جا سکتا ہے لیکن اب سب میں شاید سب سے زیادہ اہم پہلو، اس کی تنقیدی خدماتِ کا ہے ۔

نگار ہی سب سے پہلا اُردو کا رسالہ تھا جس نے جدید اصول کو سامنے رکھ کر تنقید کا آغاز کیا اور یہ سلسلہ اس وقت تک قایم ہے - پھر اس کی تنقید کا دائرہ یوں تو علم و مذہب، اور تاریخ و سیاست تک وسیع تھا، لیکن خصوصیت کے ساتھ ادب کے سلسلہ میں اس نے جتنی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اس کا صحیح اندازہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک تفصیل کے ساتھ ان کا ذکر نہ کیا جائے اور اسی خیال کو سامنے رکھ کر، بعض اکابر ادب کے اصرار پر ہم نے ارادہ کیا ہے کہ آیندہ سالنامہ صرف ان تنقیدی مقالات کے اقتباس و انتخاب پر مشتمل ہو جو اس وقت تک اساتذۂ فن کے قلم سے نگار میں شایع ہو چکے ہیں یہ مجموعہ دُنیائے ادب میں کس قدر مفید ثابت ہوگا، اس کا اندازہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے، جس نے نگار کا التزام کے ساتھ مطالعہ کیا ہے - اس مجموعہ کی ضخامت کا اندازہ کم از کم تین سو صفحات کیا جاتا ہے اور ہم کوشش کریں گے کہ یہ اسی سال کے اختتام تک طیار ہو جائے اور جنوری ۱۹۵۰ء کے پہلے ہفتہ میں شایع ہو جائے خریداران نگار سے اسکی قیمت صرف ایک روپیہ زاید لیجائیگی لیکن غیر خریداران نگار کو چار روپیہ میں مل سکے گا -

منیجر نگار لکھنؤ

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد (۵۶) | فہرست مضامین جولائی سنہ ۱۹۴۹ء | شمارہ (۱)

ملاحظات ---------- ۵

ادب اور تنقید ---- علی سجاد قہر اکبر آبادی ام اے ---- ۹

برطانیہ کے عجیب و غریب قوانین ---------- ۱۵

ہندوستان کی آیندہ زبان --- ح - ا ---------- ۱۷

مجمع یا بھیڑ ---- (پروفیسر) جلیل احمد --- ۲۳

گھریلو گیت ---- بسم اللہ بیگم ---------- ۲۸

تعلیم اور تربیت ---- محمد عظیم ---------- ۳۴

سرزمین سندھ کی ایک تاریخی کہانی ---------- ۳۹

طلسم عالم کی نقاب کشائی ---------- ۴۴

آدمی انسان ---------- ۴۵

یہاں وہاں سے ---------- ۴۷

مہدی آخرالزماں سے! (نظم) -- شور علیگ -- ۵۲

غزل ---- رضا قریشی ---------- ۵۴

جرأت گفتار (نظم) --- افسر سیمابی احمد نگری --- ۵۵

انتخاب کلام حسرت اُستاد جرأت ---------- ۵۶

مرثیہ نگاری اور میر انیس -- ڈاکٹر محمد احسن فاروقی - ۵۷-۶۴

ملاحظات

بدقسمت ہندوستان

انسانوں کی طرح بعض ملک بھی بدنصیب ہوتے ہیں اور ہندوستان بھی غالباً ایسا ہی ملک ہے -- اس کی بدبختی کی تاریخ اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب سب سے پہلے آریا قوم وسط ایشیا کی طرف سے یہاں آئی اور یہاں کی اصلی آبادی کو اُبھرنے کا کوئی موقعہ نہ دیا گیا حتےٰ کہ ہندوؤں کی اونچی قومیں جو اپنے آپ کو آرین نسل میں شمار کرتی ہیں اب بھی ان سے نفرت کرتی ہیں اور ان کو اچھوت کہتی ہیں۔

ہندوؤں کے بعد مسلمانوں کی حکومت ہوئی، اور اعلیٰ نسل کے ہندوؤں کا بھی اقتدار ختم ہوگیا۔ مسلمانوں کے بعد انگریز آئے جو ہندو مسلمان دونوں سے مذہبی، ثقافتی اور ملکی تعلق دور کا بھی نہ رکھتے تھے۔ مسلمانوں کے زمانہ میں

خیر یہ تو تھا کہ جب ان کی سلطنت مستقلاً قایم ہوگئی تو ملک کی دولت ملک ہی میں رہی - لیکن انگریزوں نے تو اس کو ویرانہ ہی بنا کر چھوڑا - ظاہر ہے کہ جب ظلم اپنی آخری حد تک پہونچ جاتا ہے، تو مظلومیت کا احساس بھی ردّ عمل پیدا کرتا ہے اور یہی وہ چیز تھی جس نے کانگرس کو پیدا کیا اور آخر کار مہاتما گاندھی کی قیادت میں اس نے اتنی قوت حاصل کی کہ انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنا پڑا اور صدیوں کی غلامی کے بعد ملک کو آزادی کی راحت نصیب ہوئی - لیکن جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ ہندوستان شاید قدرت ہی کی طرف سے بدنصیب واقع ہوا ہے، آزادی ملنے کے بعد بھی اس کو امن وسکون نصیب نہیں اور ملک کی وہی جماعت جس نے حصول آزادی کے لئے بڑی بڑی قربانیاں کی تھیں، اپنا اثر و اقتدار کھوتی جا رہی ہے اور وہ دن غالباً دور نہیں کہ ملک کی آزادی نہایت مکروہ قسم کی خانہ جنگی اختیار کرلے -

اس اندیشہ کا اظہار ہم اس سے قبل بھی کر چکے ہیں اور آج جبکہ بنگال کی شورش کافی خطرناک صورت اختیار کرتی جاتی ہے، ہم زیادہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہماری ذہنیتوں کے اختلاف کا یہی عالم رہا اور کانگرس اپنا کھویا ہوا اثر و اقتدار واپس نہ لاسکی، تو ہندوستان کو ایک ایسے خونیں دور سے گزرنا ہی جسکی نہ شدت کا صحیح اندازہ کرنا آسان ہے اور نہ اس کے عواقب و نتائج کا -

اس سلسلہ کا اہم ترین واقعہ جس سے ہماری آنکھیں کھل جانا چاہئے، کلکتہ میں سرت چندر بوس کے انتخاب کا واقعہ ہے جو کانگرس کے نامزد کردہ ممبر کے مقابلہ میں ہزاروں ووٹ سے کامیاب ہوئے -

پھر سوال صرف کانگرسی ممبر کی شکست کا نہیں، بلکہ اس ذہنیت کا ہے جو اس سلسلہ میں کلکتہ کی آبادی کی طرف سے ظاہر ہوئی - سرت چندر بوس کا انتخاب دراصل ایک امتحان تھا کانگرس کے اثر و اقتدار کا جس میں افسوس ہے کہ وہ ناکام رہی، اور نہ صرف ناکام بلکہ اس سلسلہ میں بعض ایسے مناظر بھی اس کے سامنے آئے کہ آیندہ کے لئے اسے ان سے سبق حاصل کرنا چاہئے -

اس انتخاب میں کانگرس نے اپنی پوری قوت صرف کردی تھی، یہاں تک کہ پنڈت جواہر لال نہرو اور پٹیل دونوں نے ذاتی طور پر اپیل کی تھی کہ کانگرسی امیدوار کے حق میں رائے دیجائے، لیکن باوجود اس کے آپ کو معلوم ہے کہ پولنگ کے وقت کیا ہوا -

ٹھیک اس وقت جبکہ پولنگ ہو رہی تھی اور کلکتہ کے بازاروں میں زبردست مسلح پولیس گشت کر رہی تھی، مخالف پارٹی نے شریمتی سوچیتا کرپلانی (سابق صدر کانگرس کی بیوی) کو گالیاں دیں، ان پر کیچڑ اُچھالی گئی، تھپڑ لگائے گئے اور کانگرس مُردہ باد کے نعرے لگائے گئے - یہ دیکھ کر ایک اور خاتون رینو کا رائے ان کی مدد کے لئے بڑھیں تو ایک آدمی نے ان کی چوٹی پکڑ کر کھینچ لی - اور آخر کار کانگرسی امیدوار آٹھ ہزار ووٹوں کی کمی سے ہار گیا -

ظاہر ہے کہ یہ نتیجہ ہے صرف اُس بات کا کہ کانگرس کا اثر اُٹھتا جا رہا ہے اور اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں

کہ خود کانگرس کے اندر پھوٹ پڑگئی ہے۔ چنانچہ آپ یہ سُنکر حیران ہوں گے کہ ٹھیک انتخاب کے دن تک بنگال کانگرس کمیٹی کے دونوں گروہ کی لڑائی ختم نہ ہوئی اور جب ۱۴ جون کو وزارت کی مخالف جماعت نے سرنیدر سوہن گھوش کو اکثریت سے اپنا صدر چُن لیا تو وزراء پر حملہ کیا گیا اور متعدد کانگریسی مجروح ہوئے۔

پھر اس کے بعد سے جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں، کمیونسٹ جماعت کی طرف سے برابر مسلح شورش جاری ہے اور حکومت کو بھی جواباً تیغ و تفنگ سے کام لینا پڑ رہا ہے۔

پھر اس سے زیادہ بدنصیبی ہندوستان کی اور کیا ہو سکتی ہے کہ کانگرس جس نے ملک کو آزاد کرایا، آج اس سے آزاد ہونے کی تحریک ملک میں عام ہوتی جا رہی ہے اور اگر دُنیا میں کوئی بات بغیر کسی سبب کے نہیں ہو سکتی، تو اس کا سبب کانگرس حکومت کو خود اپنے ہی اندر تلاش کرنا چاہیئے۔

اس باب میں ڈاکٹر پٹابھی سیتارمیا (صدر کانگرس) نے جو بیان دیا ہے اس کا ایک حصّہ بہت زیادہ دلچسپ ہے۔ انھوں نے کہا کہ "ہندوستان کی خوش قسمتی تھی کہ اس کو بہت پُرامن طریقہ سے اختیارات مل گئے لیکن اس کا مخالف پہلو بھی قابل غور ہے اور وہ یہ کہ اگر یہ اختیارات فوجی حکومت کے تشدد آمیز طریقوں سے حاصل ہوتے تو عوام میں یہ بددلی نہ ہوتی جو آج پائی جاتی ہے کیونکہ اس وقت بلیک مارکیٹ سے فایدہ اُٹھانے والوں کو گولی سے اُڑا دیا جاتا، رشوت لینے والوں کو درختوں میں لٹکا کر پھانسی دیدیجاتی، اور اس طرح دوسرے قومی مجرموں کو عبرتناک سزائیں دیکر تمام برائیوں کو جڑ سے اُکھاڑ دیا جاتا۔ لیکن ہم ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ حکومت مروجہ قوانین کی پابند ہے اور ملک شہری آزادی کو انسداد جرائم پر ترجیح دیتا ہے"۔

صدر کانگرس کے اس بیان سے حکومت کی جس مجبوری پر روشنی پڑتی ہے وہ یقیناً بڑی تلخ حقیقت ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا حکومت کی کمزوری اور ارکان حکومت کی فرض ناشناسی دور کرنے کی کوئی صورت سوا اس کے نہیں ہے کہ یہاں فوجی حکومت قایم کر دیجائے۔؟

ہم سمجھتے ہیں کہ اگر کانگرس کے اندرونی اختلافات دور ہو جائیں (جس کا اعتراف انھوں نے بھی کیا ہے) اور کانگرس پھر اسی بے تعصبی اور آزاد خیالی کی راہ پر آجائے جو مہاتما گاندھی نے بتائی تھی تو بغیر فوجی حکومت کے بھی اصلاح ہو سکتی ہے ــ لیکن اگر یہ ممکن نہیں ہے، تو پھر بہ حالات موجودہ حکومت کا زوال اور اسی کے ساتھ خانہ جنگی ایک کھُلا ہوا منطقی نتیجہ ہے، جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

پاکستان اور روس

جب سے یہ خبر شایع ہوئی ہے کہ صاحبزادہ لیاقت علی خاں کو اسٹالن نے روس آنے کی دعوت دی ہے، یوروپ و ایشیا ہر جگہ اس پر رائے زنی ہو رہی ہے

چنانچہ اس سلسلہ میں بمبئی کرانیکل میں ایک بہت دلچسپ کارٹون شایع ہوا ہے جس کا اگر ہم فیچر بنائیں تو صورت یہ ہوگی:-

افراد :- ایک شکاری (لیاقت علی خاں)

ریچھ (اسٹالن)

شکاری ہاتھ میں بندوق لئے ہوئے جارہا ہے کہ جنگل میں اسے دفعتاً ایک ریچھ نظر آجاتا ہے، دونوں کی نگاہیں ملتی ہیں :-

ریچھ بولا :- "کہو میاں شکاری کس چیز کی تلاش ہے"

شکاری :- "مجھے ایک کوٹ سمور کا چاہئے"

ریچھ :- "مجھے بھی ناشتہ کی ضرورت ہے۔ آؤ میرے بھٹ میں، وہیں باتیں ہوں گی"

دونوں بھٹ میں چلے جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد تنہا ریچھ باہر نکلتا ہے، اس حال میں کہ شکاری اسکے پیٹ کے اندر ہوتا ہے۔ اور اس طرح شکاری کو سمور کا کوٹ مل جاتا ہے اور ریچھ کو اپنا ناشتہ"

مدعا یہ کہ لیاقت علی خاں اور اسٹالن کی ملاقات کا نتیجہ یہ ہوگا کہ روس کی یہ دعوت در اصل پاکستان کو ہضم کرنے کا پیش خیمہ ہے۔

جس حد تک روس کی تمناؤں کا تعلق ہے، یہ خیال بالکل درست ہے کیونکہ کراچی پر تسلط کا خواب وہ عرصہ سے دیکھ رہا ہے، لیکن جس حد تک پاکستان کی ذہنیت کا تعلق ہے، ہم کو دشوار نظر آتا ہے کہ وہ اصول اشتراکیت کو آسانی سے قبول کریگا

بعض کا خیال ہے کہ اس ملاقات میں صرف تجارتی معاہدوں کے متعلق گفتگو ہوگی، بعض جو زیادہ بال کی کھال نکالنے والے ہیں، وہ افغانستان و پاکستان کی باہمی کشش کو اس کا سبب قرار دیتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو کشمیر کے جھگڑے سے اسے متعلق سمجھتے ہیں — اسوقت دو مسئلے پاکستان کے سامنے بہت اہم ہیں، ایک کشمیر کا مسئلہ اور دوسرا سرحدی قبایل کا جن کی حمایت افغانستان کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ بیک وقت وہ دونوں طرف اپنی قوت استعمال نہیں کر سکتا اور قدرتاً اسکی خواہش یہی ہوگی کہ وہ ان میں سے کسی ایک کو پہلے طے کرے پھر چونکہ کشمیر کا مسئلہ کمیشن کے ہاتھ میں ہے اور اسکے فیصلہ کرنے یا سپرد ڈالنے تک کافی وقت گزر جائے گا، اس لئے ممکن ہے کہ پاکستان پہلے اس کشش کو دور کرے جو افغانستان سے پیدا ہوگئی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ قبایلی علاقہ کے باب میں انگریزوں کے زمانہ میں افغانستان کی رگِ حمیت کیوں نہیں اُبھری۔ اور اب جبکہ سرحد پر ایک مسلم حکومت قایم ہوگئی ہے، یہ پالیسی اس نے کیوں اختیار کی۔ اسکا سبب صرف یہ ہے کہ انگریزوں کے منہ آنے کی اسمیں ہمت نہ تھی اور روس اس قدر مضبوط نہ تھا کہ افغانستان اسپر اعتماد کر سکتا۔ پھر اب کہ انگریز بھی یہاں سے چلا گیا ہے اور روس کی قوت بھی بہت بڑھ گئی ہے، افغانستان کا روس کے اشارہ پر چلنا مستبعد نہیں اور اگر واقعی اس میں کوئی اصلیت ہے تو پھر روس کا وزیر اعظم پاکستان کو دعوت دینا بھی یقیناً اسی لئے ہے کہ وہ دباؤ ڈال کر پاکستان سے تجارتی مراعات حاصل کر سکے یا لداخ پر اپنا اثر و اقتدار قایم کرنے کی کوشش کرے۔

ادب اور تنقید

انسان کم و بیش ہمیشہ سے شعر و ادب میں دلچسپی لیتا رہا ہے اور فنکاروں کے شہ پاروں سے لطف اندوز بھی ہوتا رہا ہے۔ ایسا زمانہ شاید کبھی نہ گزرا ہو کہ لوگ شعر و ادب کا مطالعہ کرتے کرتے شعر و ادب کے حسن و قبح معلوم کرنے اور شاعر و ادیب کے کارناموں کو پرکھنے کی طرف مایل نہ ہو گئے ہوں۔ اِسی جذبہ کو علمی اصطلاح میں 'تنقید' کہتے ہیں۔

تنقید کا ماخذ یونانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں "فیصلہ کرنا" یا "پرکھنا"۔ اس لئے تنقید ادب کی اُس شاخ کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ مختلف فنونِ لطیفہ اور اصنافِ ادب کو پرکھا جائے اور اسی فن فہمی یا ادب فہمی کا نام تنقید ہے۔ یوں تو فنکاروں کے نتائجِ فکر کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لئے تنقید کو فن کی حیثیت سے جاننا ناگزیر ہے مگر اس کا جاننا یوں بھی ضروری ہے کہ یہ اپنے ذوق و وجدان کی تسکین کا سبب بنتا ہے۔

یوں تو اُصولِ تنقید ہر زمانہ میں ادب کی نشو و نما اور ارتقاء کے ساتھ ساتھ بنتے، بدلتے اور بگڑتے رہتے ہیں لیکن ایک بھدی شکل و صورت اور سطحی روپ میں تنقید کا ادب کے ساتھ شروع ہی سے پایا جانا ضروری ہے۔ ایک شخص کے اس احساس کے ساتھ کہ فلاں بات کو اُس طرح نہیں اِس طرح کہنا زیادہ اچھا ہے اور ایک ہی قسم کے ایک سے زاید فنپاروں میں سے کسی ایک خاص فنپارہ کو ترجیح دینا چاہئے تنقید کی ابتداء ہو جاتی ہے۔ کسی چیز کی پہچان اور قدر و قیمت موازنہ ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔ گویا تنقید کی ابتداء ہر ادب کی ابتداء کے ساتھ ہی ساتھ ہو جاتی ہے خواہ وہ کسی شکل میں کیوں نہ ہو اور پھر جوں جوں ادب پروان چڑھتا ہے تنقید بھی ادب ہی کے دوش بدوش پروان چڑھنے لگتی ہے۔ شعر و ادب کی نئی نئی کروٹوں کے ساتھ جو زندگی کی بدلتی ہوئی اقدار کا لازمی نتیجہ ہوتی ہیں تنقید کے نظرئے بھی بدلتے جاتے ہیں۔ جب نئے تجربات۔ نیا شعور نئی معلومات، نئی بیداری۔ نیا نظامِ تمدن۔ نیا طریقۂ تعلیم۔ نئے سماجی حالات اور نئے نظرئے اپنے ساتھ نئے الفاظ۔ نئے محاورات اور نئے اسالیبِ بیان لاتے ہیں تو پھر ہر چیز کی قدروں کی جانچ اور پرکھ بھی نئے طریقوں سے شروع ہو جاتی ہے اس لئے یہ کہنا شاید بیجا نہ ہوگا کہ ادبی جد و جہد کے سلسلہ میں، اور ادب و شعر کو سمجھنے۔ سمجھانے اور آگے بڑھانے کے معاملہ میں تنقید ایک امتیازی شان و درجہ کی مالک ہے۔

تنقید کی اتنی تعریفیں کی گئی ہیں اور اس کو اتنے مختلف پہلوؤں سے دیکھا گیا ہے اور اُس پر اتنے زاویوں سے خیال آرائی کی گئی ہے اور اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اگر اُن کا صرف ایک سرسری جایزہ لیا جائے تو بھی ایک ضخیم کتاب تیار

ہو سکتی ہے۔ اس کے مفہوم و مقاصد میں اپنے اپنے زمانہ و ماحول اور رجحانات و میلانات کے مطابق اتنی تبدیلیاں ہوئی ہیں کہ اس کی کوئی ایک مختصر جامع و مانع تعریف کرنا اور ایک دو فقروں میں اس کے مقصد کو متعین کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں تنقید صرف لغوی قواعد کی پابندی، چند بندھے ٹکے اصول و ضوابط کی تطبیق اور اہل علم و متقدمین کی تفصیل اُس کے مضامین کی معنوی اور لغوی جانچ پر ختم ہو جاتی تھی لیکن آج تنقید کا میدان اپنی ہمہ گیری اور عظمت کے لحاظ سے بہت وسیع ہو چکا ہے۔ تنقید آج ایک مستقل علم ہے جس کا کام ہمارے اُس ادب کی "نگرانی" اور "احتساب" ہے جو ہماری زندگی کے بننے اور بگڑنے میں بڑا دخیل ہے۔ موجودہ تنقید اس نگرانی و احتساب کے علاوہ فیصلہ کرنے کے فرائض بھی انجام دیتی ہے اور اس نگرانی و فیصلہ میں اس کا طریق کار بھی مخصوص و متعین ہے جس کا ذکر آگے چل کر کیا جائے گا۔ علمائے تنقید جدید کی اصطلاح میں صحیح تنقید کا مفہوم یہ ہے کہ تاریخ ادب میں زیر تنقید کتاب یا فنپارہ کے 'درجہ' کی وضاحت کی جائے جس زمانہ میں وہ کتاب یا فنپارہ تخلیق کیا گیا ہے اُس زمانہ کے ساتھ اُس کا تعلق اور ربط بنایا جائے۔ تصنیف و مصنف کے مابین رشتہ و رابطہ کی جستجو کی جائے اور مصنف کے ماحول اور وقت کے تقاضوں کی روشنی میں، نیز اُس زمانہ کے رجحانات و میلانات اور بدلتی ہوئی اقدار کے تحت اُس کے کارنامہ کا جایزہ لیا جائے۔ اس طرح تنقید کو رانہ جستجو اور قدما کے بنائے ہوئے قوانین اور لغوی استنباط کے پھندے سے آزاد ہو کر صرف تجربات و مشاہدات بدلتے ہوئے رجحانات و میلانات کی ٹھوس حقیقت اور مصنف و ماحول کے رشتۂ ارتباط ہی کو معیار صداقت سمجھنے لگی۔

غرض تنقید ایک 'علم' کی حیثیت سے دورِ حاضر کی پیداوار ہے۔ یہ علم مغرب میں اپنے نقطۂ عروج پر پہونچ چکا ہے لیکن مشرقی زبانوں میں عموماً اور اُردو میں خصوصاً اب تک اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے درحالیکہ دورِ حاضر نے اُردو ادب کے تنقیدی سرمایہ میں جو کچھ اضافہ کیا ہے وہ تنہا اُردو ادب کے تمام پچھلے تنقیدی سرمایہ پر بلحاظِ اہمیت، بلحاظِ تنوع اور بلحاظِ مقدار سبقت لے گیا ہے۔ پھر بھی اُردو ادب میں شروع سے اب تک جو کچھ بھی اس موضوع پر لکھا گیا وہ مجموعی حیثیت سے بہت مختصر اور ناکافی ہے۔ اس کا سبب کیا ہے؟ اس کی تفصیل کا موقع نہیں کہ یہ ایک علٰحدہ مقالہ کا محتاج ہے اور اس کے متعلق میں اپنے ایک مضمون "تنقید کا ارتقاء اُردو ادب میں" مطبوعہ 'نگار' جولائی ۱۹۶۶ء میں کچھ روشنی ڈال چکا ہوں۔

فارسی زبان میں تو علمی حیثیت سے تنقید کا وجود ہی نہ تھا البتہ عربی زبان میں تنقید کا پتہ چلتا ہے مگر عربوں میں بھی یہ فن زیادہ تر لغوی تنقید میں محصور ہو کر صرف ابتدائی مدارج تک محدود رہا۔ مغربی مصنفین نے جیسا کہ میں سطور بالا میں اشارہ کر آیا ہوں اس فن پر بکثرت کتابیں لکھیں اور تنقید کا واقعی حق ادا کیا مگر اولیت کا سہرا یونانیوں کے سر ہے۔ سب سے پہلے یونانیوں نے اس فن پر کتابیں لکھیں۔ اُن کی تقلید میں اس کے بعد اہلِ روما نے۔ رومیوں کے بعد اس علم کو موجودہ اقوام یورپ نے اُس وقت حاصل کیا جب قسطنطنیہ کو مسلمانوں نے فتح کیا اور یونان و روما کے اہلِ علم نے اطالیہ میں جا کر پناہ لی اور سکونت اختیار کی۔ یورپ میں علم کی نشاۃ ثانیہ کے آغاز پر جب علمی روح ہر طرف پھیلنے اور بڑھنے لگی اور رفتہ رفتہ

علوم وفنون کو ترقی ہوتی چلی گئی اور مسالک و آراء میں اختلاف رونما ہوا تو تنقید کی ضرورت بدرجۂ اتم محسوس کی گئی اور اس علم نے مغرب میں وہ مرتبہ حاصل کر لیا جو اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے۔ یوں تو یورپ کی تمام قوموں نے اس علم کی پذیرائی کی اور اس کی پرورش میں حصہ لیا مگر اہلِ فرانس نے خصوصیت کے ساتھ اس پر توجہ دی اور آج علم تنقید فرانس میں اوجِ کمال پر پہونچ چکا ہے۔ اس فن نے ادبیات کو کس حد تک متاثر کیا یہ خود اپنی جگہ ایک الگ اور مستقل موضوع ہے لیکن مختصراً یہاں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس فن کا مفہوم و مقصد کیا ہے۔ اس فن کے شرائط کیا ہیں اور ایک نقاد کے کیا فرائض ہیں اور اُس کو کن اصول کی پابندی لازمی ہے۔

جناب محی الدین قادری زورؔ صاحب نے اپنی کتاب "روحِ تنقید" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "تنقید کے لفظی معنی تو ہیں کھرے کھوٹے میں امتیاز پیدا کرنا مگر اصطلاح میں کسی کی مصنفات کے معائب و محاسن کو ایک ایک کر کے دکھانا تنقید کہلاتا ہے۔ پس فنِ تنقید اُس فن کو کہتے ہیں جس میں دوسروں کے حرکات و اقوال پر انصاف کے ساتھ فیصلے صادر کئے جاتے ہیں۔ صحیح و غلط اچھے اور بُرے۔ حق و باطل کے درمیان فرق کرنے۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دکھانے ۔۔۔۔۔ نیز صحیح مذاق پیدا کرنے کی کوشش کو تنقید کہتے ہیں"۔ لیکن اگر سچ پوچھا جائے تو صرف معائب و محاسن سے بحث کرنا یا سطحی تفسیر و تشریح سے کام لینا تنقید نہیں کہلاتا صحیح تنقید فنکار کی روح کے مطالعہ کا نام ہے۔ میتھو آرنلڈ کہتا ہے کہ "انتقاد ایک بے لاگ کوشش ہے اُس چیز کے بہترین حصہ کو سیکھنے اور نمایاں کرنے کی جو دُنیا کے دائرۂ علم و خیال سے باہر نہ ہو" اس سے اُسکی مراد صرف زندگی کا مطالعہ ہے اور اس مطالعہ کے مختلف طریقوں اور اسلوبوں پر گفتگو کرنا۔ چنانچہ جس طرح ادب، محض زندگی کا مطالعہ ہے اُسی طرح تنقید بھی ایک مطالعہ ہے ادب کا۔ اگر ہم شعر و ادب کو "غربالِ حیات" کہہ سکتے ہیں تو پھر تنقید کو بھی غربالِ ادب کہنا کچھ نامناسب نہ ہوگا۔ مگر نقاد کے لئے یہ بات زیبا نہیں کہ وہ ادب کو اپنی خواہش، فطری رجحانات و میلانات اور اپنے نفسیات ذہنی و فکر کے مطابق موڑنے توڑنے پر کمربستہ ہو جائے یا پھر ادبی تحریروں پر عمل جراحی کرنے بیٹھ جائے جس طرح ایک ادیب زندگی کو سمجھنے سمجھانے اور سنوارنے کا نام ادب ہے اُسی طرح ادب کو سمجھنے۔ سمجھانے اور سنوارنے کی کوشش کا نام تنقید ہے زندگی سے جو تاثرات حاصل ہوتے ہیں اُن کو فنکارانہ پیرایۂ بیان عطا کرنا۔ یہ ہے ادب اور ادب سے جو تاثرات حاصل ہوتے ہیں اُن کا بخلوص جایزہ لینا اور ادب کو احتساب و نگرانی کے ذریعہ صحیح راستہ پر لگانا اور سنوارنا۔ یہ ہے تنقید۔ چنانچہ جس طرح ادب کے ذریعہ زندگی کی اصلاح کا بیڑا اُٹھانا اور ادب کو محض کسی خاص مقصد کے تحت پروپیگنڈے کی نذر کر دینا ادبیات کے مقصد پر ظلم ہے اسی طرح کسی ادبی نگارش میں ترمیم و تنسیخ کے ارادہ سے قلم اُٹھانا تنقید کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اناطولی فرانس کی رائے میں بہترین تنقید نگاری وہی ہے جس میں نقاد اُن مہمات کو بیان کرتا ہے جن کو اُس کی روح ادبی تحریروں کے مطالعہ کے وقت طے کرتی ہے اور واقعہ بھی یہ ہے کہ اعلیٰ تنقید وہی ہے جس کا مقصد فنکار، شاعر یا ادیب کی روح اور اُس کے افکار کے مطالعہ کے سوا کچھ نہ ہو ورنہ تنقید کی ابتدائی مشکل و صورت تو اُس لذت و مسرت کے اظہار کا نام ہے

جو کسی تخلیق کو دیکھ کر ہمارے دلوں میں پیدا ہو اور جس کو بدقسمتی سے ہمارے بعض نقادوں نے اصل تنقید سمجھ لیا ہے۔

تنقید، ادب کا ایک جزوِ لاینفک ہے۔ کسی ادبی و صناعی شاہکار کی قدر و قیمت کا کوئی صحیح اندازہ اُس وقت تک ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ طاقتِ تنقید ہماری رہنمائی نہ کرے۔ تنقید و ادب میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اِن دونوں میں ایک مضبوط ربط ہے۔ ایک ایسا ربط جو ایک دوسرے کے لئے ناگزیر ہو۔ ادب بغیر تنقید کے ایک بے جان مجسمہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور تنقید بغیر ادب کے ایک روحِ بے جسم ہے۔ ایک ایسی روح جو اپنے جسدِ ادب کے لئے پھڑک رہی ہو۔ اور جو ادب سے علٰحدہ ہو کر سانس نہ لے سکتی ہو۔ کوئی ادب اُس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ اُس میں تنقیدی مواد موجود نہ ہو۔ جب کوئی چیز وجود میں آتی ہے تو ایک معیار بھی اُس کو جانچنے کے لئے اُسی کے ساتھ پیدا ہو جاتا ہے۔ بقول پروفیسر احتشام صاحب "تنقید کا وجود تقریباً ہر ادب کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے کیونکہ ادب بغیر ایک سماجی اظہار کے ادب نہیں ہوتا اور جب سماج اس ادب کا جایزہ اپنی زندگی۔ اپنی خواہشوں اور اپنی ضرورتوں کی روشنی میں لیتا ہے تو اُسی وقت تنقید کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ ہر ادیب کے پاس اعلیٰ یا ادنیٰ تنقید کا معیار ضرور ہوتا ہے جو تخلیق کے عمل کے ساتھ ساتھ جاری رہتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اچھا تخلیقی عمل وجود ہی میں نہ آسکتا تھا۔ اچھی تخلیقی قوت، اچھی تنقیدی قوت کے بغیر ممکن ہی نہیں"

اگلے زمانہ میں تنقید صرف اُن اصول و قواعد تک محدود تھی جو متقدمین کے علوم و فنون سے اخذ کئے گئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تنقید جس کا مقصد صرف ادب و زبان کی اصلاح اور درستی تھا، اس لحاظ سے ضرور سود مند ثابت ہوئی کہ اس کے ذریعہ ادب و شعر کے فن میں ایک استقلال پیدا ہو گیا۔ ہر ادیب و شاعر کے ذہن میں ادبی کمال کا ایک معیار قایم ہو گیا۔ کلام حشو و زوائد اور اغلاط سے پاک ہو گیا اور زبان زیادہ صاف اور شستہ ہو گئی۔ مگر بایں ہمہ صحیح تنقید وہی ہے جس کا مقصد فنکار کی روح اور اس کے افکار کے مطالعہ کے سوا کچھ نہ ہو۔ تنقید کا زبردست کام یہ ہے کہ وہ ادبیات اور ادیب کی عظمت کا صحیح اندازہ لگانے میں ہماری مدد کرتی ہے۔ تاریخ ادبیات کا مطالعہ شاہد ہے کہ اگر تنقید نہ کی جاتی تو بعض فنپارے ایسے تھے جو بہت جلد فنا ہو جاتے۔ کسی مصنف کے کارنامہ میں جو کوئی بھی چیز مخفی ہوتی ہے، تنقید اُسی کو نمایاں کر دیتی ہے۔ ناقدین کے اقتدار کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ فرانس کے ایک مشہور نقاد (Taine) ٹین نے کسی رسالہ میں اپنے ایک مضمون کو شایع کرایا جس میں فرنچ ماہر نفسیات اسٹینڈ ہال (Standhal) کو بہت سراہا۔ اس وقت تک اسٹینڈ ہال کی شخصیت سے کوئی واقف بھی نہیں تھا لیکن اس مضمون کی اشاعت کے بعد اسٹینڈ ہال کی شہرت اس قدر بام عروج پر پہونچی کہ اس کے تمام ہمعصر اُس پر رشک کرنے لگے۔ نظیر اکبر آبادی کو جو درجہ آج کے ادب نے دے رکھا ہے وہ بھی ناقدین ہی کی تنقیدوں کا رہینِ منت ہے ورنہ یہ وہی نظیر اکبر آبادی ہیں کہ جب تک تنقید کے ذریعہ انکے کلام کی خوبیوں کو اُجاگر نہیں کیا گیا تھا تو ان کا کلام خواص اور ثقات و سنجیدہ لوگوں کی نظروں میں کوئی وزن نہیں رکھتا تھا علاوہ برین تنقید ہمیں سکھاتی ہے کہ ادبیات میں کون سی چیز اچھی ہے اور کون سی بُری ۔ اس طرح سے ہمارا

بہت سا وقت جو کسی مصنف کی تصنیفات کے پڑھنے اور اُس کے متعلق رائے قائم کرنے میں صرف ہوتا، بچ جاتا ہے۔ اپنی زندگی کے اختصار اور اُس کے تنوع کو دیکھتے ہوئے ہمیں مجبوراً اُن آراء ہی پر اکتفا کرنی پڑتی ہے جو تنقید نگاری کی عرق ریزیوں اور موشگافیوں اور محققین کی تحقیقوں کا نتیجہ ہیں۔ تنقید کا ایک اعلیٰ مقصد یہ بھی ہے کہ وہ عوام کو مصنف کی طرف متوجہ کر دے اور اُن فنکاروں کو جو گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں اور جو زمانہ کی ناقدری سے منظرِ عام پر نہیں آسکے ہیں عوام کے سامنے لے آئے۔ تنقید کی ایک غرض و غایت یہ بھی ہے کہ وہ ادبی مذاق کی ترتیب و تہذیب میں کوشش کرے۔ اگر نقادانِ فن اپنی تحریروں سے ادیبوں پر ایک طرح کا احتساب رکھیں تو بہت ممکن ہے کہ ادبی مذاق بگڑ جائے۔

مقاصدِ تنقید کے بیان کر دینے کے بعد تنقید نگار کے فرایض کا مسئلہ بھی تقریباً حل ہو جاتا ہے۔ مگر پھر بھی جس طرح ادیب کو اپنے فن کے پیش کرنے میں ایک حد تک آزادی ہے اور باوجود ادب میں جمہوری میلانات کا خیال رکھنے کے ادیب اپنے انفرادی رجحانات و میلانات کو بھی راہ دیتا ہے۔ بالکل اُسی طرح ایک نقاد کے فرایض کو ریاضی کی رو سے دو اور دو چار کی طرح معین کرنا تقریباً ناممکن ہے اور نقاد بھی اپنے انتقادی جایزوں میں ایک حد تک آزاد ہے اور ہر نقاد اپنے نظریۂ ادب کو سامنے رکھ فنکاروں کے شہ پاروں پر تنقید کرتا ہے۔ اگر نظریۂ ادب پہلے عقلی اصول کے مطابق مقرر کر لیا جائے تو پھر ممکن ہے کہ تنقید کا بھی کوئی اصول مستنبط ہو سکے۔ بعض نقاد ادب کا مقصد تفریح قرار دیتے ہیں۔ وہ سارے ادب کا مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کرتے ہیں۔ بعض اپنے احساسِ جمال کی تسکین یا انفرادی لذت اندوزی سمجھتے ہیں۔ بعض ادب کو صرف صناعانہ پہلو سے دیکھتے ہیں۔ بعض کے نزدیک ادب صرف زندگی کی تفسیر ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ مصنف اور تصنیف کے رشتۂ اتحاد و ارتباط کو سمجھ کر مصنف کی شخصیت کو اُجاگر کر دینا ہی نقاد کا فرض ہے۔ بعض ادب میں نظریۂ افادیت کے قایل ہیں اور اُنکے نزدیک وہ ادب جس سے سماج اور عوام کی کوئی خدمت نہ ہوتی ہو فضول ہے۔ ایسے لوگ ادب میں "روحِ جمہور" کے متجسس رہتے ہیں اور اسی نظریہ کو سامنے رکھ کر تنقیدیں کرتے ہیں۔ بعض اخلاق کو ادب میں بہت ضروری سمجھتے ہیں اور ادب کو اسی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے ہیں۔ بعض ادب کے درمیان شعور و لاشعور کے دھندلکے میں نفسیات کی گتھیوں کو سلجھانے اور اسرارِ حیات کی نقاب کشائی کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں اور اسی عقدہ کشائی میں ادبیات کے مقصد کو تلاش کرتے ہیں غرض نقاد ادب کے مختلف نظرئے لیکر اُٹھتے ہیں اور جن زوایا سے وہ ادب کا مطالعہ کرتے ہیں اُنھیں میلانات کی روشنی میں تمام شعر و ادب کا جایزہ لینا چاہتے ہیں۔

مندرجۂ بالا نظریات شعر و ادب اور دیگر مقاصدِ ادب کو سمیٹ کر اگر ان کی حد بندی کی جائے تو ان تمام نظریات و مقاصدِ ادب کے ماننے والے تین بڑے گروہوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ ایک وہ گروہ جو فن برائے فن، کا قایل ہے اور ادب سے صناعانہ پہلو کسی طرح بھی جدا نہیں کر سکتا۔ دوسرا گروہ اُن لوگوں کا ہے جو ادب کو تفریح کا آلہ سمجھتے ہیں اور جو فن سے مسرت کا پہلو الگ نہیں کر سکتے۔ تیسرے وہ لوگ ہیں جو ادب اور افادیت کو ہم آغوش دیکھنا چاہتے ہیں۔

ایسے لوگ اُس ادب کو ادب ہی نہیں سمجھتے جس سے عوام کو کوئی فایدہ حاصل نہ ہو اور ان تینوں نظریات کو ماننے والے انھیں اصول کو سامنے رکھکر فنکاروں کے کارناموں کا مطالعہ کرتے ہیں - لیکن اگر نظر غور سے دیکھا جائے تو درحقیقت یہ تینوں گروہ انتہا پسند نظریات کے حامل ہیں اور ایسے لوگوں کی تنقیدیں حقیقی تنقیدیں نہیں کہی جاسکتیں کیونکہ وہ کسی ایک خاص انتہا پسند زاویۂ نظر کی اشاعت کرتی ہیں - نقاد کو غیر جانبدار ہونا چاہیئے کیونکہ تنقید میں جذبات و ذاتی پسندیدگی اور شخصی رجحانات وانفرادی میلانات کو راہ دینے والا نقاد کبھی بے لاگ تجزیہ نہیں کرسکتا - ایک معیاری نقاد کا کام تشریح - فیصلہ اور تعیینِ مراتب ہے ایک نقاد کا فرض یہ ہے کہ وہ مصنف کی تصنیف اور اُس کے موضوع سے بحث کرے اور مصنف اور زمانۂ تصنیف کی باہمی مناسبت ظاہر کرکے اُن فنپاروں سے مقابلہ و موازنہ کرے جو اُسی زمانہ میں اور اُسی موضوع پر لکھے گئے ہوں ایک نقاد کے لئے سی تاریخ سے واقف ہونا ازبس ضروری ہے تاکہ وہ ادب اور زندگی کا مطالعہ خاص طور سے کرے کیونکہ ادب خواہ برائے حیات ہو یا برائے ادب یا برائے مسرت، زندگی سے کسی صورت سے بھی علٰحدہ نہیں کیا جاسکتا مثال میں ہر زمانہ اور ہر قوم کا ادب موجود ہے جو اپنے ماحول اور اپنے زمانہ کی زندگی کا عکس بھی ہے اور ترجمان بھی - غرض ایک نقاد کو اسی "زندگی اور ادب" کے مطالعہ کی روشنی میں ادبی کارناموں کی اہمیت کا اندازہ لگانا چاہیئے - نقاد کا فرض ہے کہ وہ ادیب و فنکار کے خلوص کا پتہ لگائے کیونکہ بغیر خلوص کے کسی صالح ادب کی تخلیق نہیں ہوسکتی اور نہ فنکار اپنے فنپارہ میں اثر و تاثیر پیدا کرسکتا ہے - ادب کے پائدار اور بہترین حصّوں کی تعیین مراتب کرنا - رطب و یابس اور کھرے کھوٹے میں تمیز کرنا - صالح اور کثیف ادب میں فرق بتانا، ایک نقاد کے فرایض میں شامل ہیں - اگر ادیب یہ سب کام خود ہی انجام دے لیا کرتے تو کبھی نقادوں کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوا کرتی - نقاد کا کام تحریب و تنقیص یا محض تعریف نہیں ہے بلکہ تشریح، انتخاب ترتیب اور تعیینِ مراتب ہے - ایک نقاد کا کام تعمیر ہے نہ کہ تخریبی - اگر نقاد خلوص اور غیر جانبداری سے کام لے تو وہ صالح ادب کی تخلیق میں حصہ لے سکتا ہے -

علی سجاد مہر اکبر آبادی - ایم - اے

شہوانیات کیا ہے؟

منجملہ ۱۲۴ عنوانات کے چند خاص عنوان ملاحظہ ہوں :- فحاشی کی تعریف اور اسکی ابتدا ـــ شادی، طلاق و خلع ـــ مذہبی فحاشیاں ـــ فحاشی پر عمومی تبصرہ ـــ استلذاذ بالمثل ـــ استلذاذ بالنفس ـــ استلذاذ بالوحوش ـــ فحاشی عہدِ قدیم میں ـــ فحاشی قرونِ وسطیٰ میں ـــ عہدِ جدید اور فحاشی ـــ اخلاقِ جنسی ـــ جنسی میلانات اور شہوانی خواہشوں پر اتنا جامع، تاریخی، علمی و نفسیاتی تجزیہ آپ کو کہیں اور نظر نہ آئے گا - حضرت نیاز کی سالہا سال کی تحقیق و جستجو کا نتیجہ ہے اور اُردو میں سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر یہی ہے -

حجم ۳۱۶ صفحات - کاغذ سفید و دبیز - قیمت علاوہ محصول چار روپیہ -

مینیجر نگار لکھنؤ

برطانیہ کے عجیب و غریب قوانین

انگلستان کے دارالعوام کو خطاب کرتے ہوئے ایک ممبر پارلیمنٹ نے حال ہی میں کہا کہ "اس وقت برطانیہ میں ۶۰۰ ۴ قواعد و ضوابط رائج ہیں اور زندگی کے اتنے مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں کہ وہاں کی کوئی جماعت کا کوئی فرد ایسا نہیں جس پر وہ کسی نہ کسی طرح مایدنہ ہوتے ہوں"۔

برطانوی پبلک فخر کرتی ہے کہ اس سے زیادہ قانون و قاعدہ کی پابندی دنیا کی کوئی قوم نہیں کرتی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر وہاں کے قوانین و قواعد پر پوری طرح عمل کیا جائے تو وہاں ایک مرد، ایک عورت اور ایک بچہ بھی ایسا نہیں نکل سکتا جو کسی نہ کسی پہلو سے قانون کی زد میں نہ آتا ہو اور وہاں کا انسان پیدائش کے دن سے لیکر موت کی آخری ساعت تک کسی نہ کسی حیثیت سے مجرم نہ قرار دیا جائے۔ چنانچہ اب وہاں کی پارلیمنٹ نے ان تمام قواعد و ضوابط پر غور کرنے اور ان کو منسوخ یا تبدیل کرنے کے لئے دس آدمیوں کی ایک کمیٹی بنادی ہے جس کے صدر لارڈ چانسلر ہیں اور ان کو ہدایت کی گئی ہے کہ صدیوں قبل کے قواعد و قوانین جو اب تک منسوخ نہیں ہوئے ہیں اور جن کی اب واقعی کوئی ضرورت نہیں ہے ان کی منسوخی کی سفارش کرے۔ لیکن شاید آپ کو یہ سنکر حیرت ہوگی کہ یہ کام پندرہ سال سے قبل ختم نہیں ہو سکتا اور اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ دفتر مزخرفات وہاں کتنا بڑا ہے۔

ذیل کے چند قواعد سے آپ کو معلوم ہوگا کہ باوجود اس قدر ذہنی ترقی کرنے کے بھی انگلستان میں اب تک کتنے احمقانہ قوانین رائج چلے آرہے ہیں:۔

۱۔ ۱۲۶۴ء میں وہاں ایک قانون نافذ کیا گیا کہ بیک وقت دو قسم کے کھانوں سے زیادہ کھانا قانوناً جرم ہے۔

۲۔ جنوبی علاقہ کے رہنے والے بدھ کے دن، شمالی علاقہ کے رہنے والے جمعہ کے دن اور مشرقی علاقہ کے رہنے والے سنیچر کے دن گوشت نہیں کھا سکتے اور اس کے خلاف عمل کرنے والوں کو سخت سزا دیجائے گی۔

۳۔ مغربی علاقہ میں کرسمس کے دن منس پائی (ایک خاص قسم کا کھانا) اور ویلس کے علاقہ میں ایسٹر کے دن لیکس (ایک خاص ترکاری) کھانا اور ڈوون شائر میں خاص تعطیلوں کے موقعہ پر سائڈر (ایک خاص قسم کی شراب) استعمال کرنا جرم ہے جس کی یا دداشت میں مجرم کو سزائے قید دیجا سکتی ہے

۴۔ سترھویں صدی کے ایکٹ آف پارلیمنٹ کی رو سے اتوار کے دن کوئی کام کرنیوالا سخت سزا کا مستوجب ہے۔ بعض

علاقوں میں اتوار کے دن تین میل سے زیادہ اور بعض علاقوں میں ۵ میل سے کم چلنا قانونی جرم ہے۔ (یہ مسافت گرجا کے جانے و قوع کے لحاظ سے مقرر کی گئی تھی)

(۵) سومرسٹ میں اتوار کے دن بھی وہی کپڑے استعمال کرنا جو دوسرے معمولی دنوں میں پہنے جاتے ہیں قانوناً جرم ہے۔ ڈربی میں لکڑی کی جگہ چمڑے کے تلوں کے جوتے پہننا اور یارک شائر میں اتوار کے دن یا عام تعطیلوں کے ایام میں بھنا ہوا گوشت نہ کھانا جرم ہے۔

(۶) کنٹ میں بدھ کے دن درختوں سے اخروٹ توڑنا اور لکڑی کے علاوہ کسی اور چیز سے زمین کے اندر سے آلو نکالنا، مستوجب سزا ہے۔

(۷) ۱۶۷۷ء میں ایک قانون نافذ کیا گیا کہ انگلستان بھر میں کسی شخص کا اتوار کے دن خرید و فروخت کرنا یا اخبار پڑھنا اپنے آپ کو سزائے قید کا مستوجب بنانا ہے۔

(۸) اتوار یا کرسمس کے دن کسی چیز کے رہن رکھنے کی پاداش میں وہاں ۱۰ پونڈ جرمانہ کی سزا مقرر ہے، اسی طرح گھوڑے کی جگہ کتے کو گاڑی میں جوڑنے کا جرمانہ دو پونڈ، شاہراہ عام کی کسی جھاڑی کو کاٹنے کی سزا ایک ہفتہ قید۔ صبح آٹھ بجے کے بعد راستہ یا گلی میں چٹائی یا کسی قسم کے کپڑے کو جھاڑنے پر دس شلنگ جرمانہ۔

(۹) کوئی سپاہی، مزدور بلکہ معزز آدمی بھی اتوار کے دن تاش نہیں کھیل سکتا۔

(۱۰) ٹیلی فون پر کوئی فرضی کہانی دیو پری کی سنانا دس پونڈ جرمانہ کا مستوجب بناتا ہے۔

(۱۱) ۱۹۲۴ء میں ایک قانون کے ذریعہ سے پرائویٹ یا پبلک جلسہ میں ریڈیو لاؤڈ اسپیکر سے کام لینے کی ممانعت کی گئی۔

(۱۲) ۱۷۶۵ء میں ایک ایکٹ پاس کیا گیا جسکی رو سے بدزبانی یا گالی کے لئے مختلف جرمانے مقرر کئے گئے۔ چنانچہ راستہ میں معمولی آدمی کی معمولی گالی کی سزا ایک شلنگ جرمانہ اور کسی معزز و شریف کی طرف سے گالیوں کی بوچھار کی سزا پانچ شلنگ مقرر کی گئی۔ اگر پولیس کی طرف سے حسب دارج جرمانہ عاید کرنے میں کوئی غلطی ہو جاتی تھی تو اس کا معاوضہ پولیس سے دلایا جاتا تھا۔

(۱۳) انگلستان کے چھ ساحلی علاقوں میں بغیر جوتے پہنے سمندر میں نہانا خلاف قانون ہے۔ اسی طرح ہر شخص کا یہ فرض قرار دیا گیا کہ اگر وہ کسی شخص کو بہت تیز گاڑی چلاتے ہوئے دیکھے تو فوراً گرفتار کرے اور اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو اسے وہی سزا دیجائے گی جو اصل مجرم کے لئے مقرر ہے۔

(۱۴) ۱۷۷۰ء میں ایک قانون نافذ کیا گیا کہ کوئی عورت عطریات، غازہ، مصنوعی دانت، مصنوعی بال یا اونچی ایڑی کا جوتا استعمال کر کے کسی مرد کو شادی کی طرف مایل نہیں کر سکتی اور اگر ایسا کیا گیا تو شادی ناجایز قرار دی جائے گی۔

الغرض یہ اور اسی قسم کے ہزاروں قواعد ہیں جو صدیوں سے نافذ ہیں، اور جن کو منسوخ کرنے کے لئے اب ایک کمیٹی مقرر کی گئی ہے۔

ہندوستان کی آیندہ زبان

زبان کا مسئلہ قومی تفاخر اور قومی ضروریات سے اس قدر وابستہ ہے کہ اپنی یا غیر کی زبان کو کسی سائنٹفک طریق پر یعنی علمی حیثیت سے معرضِ بحث میں لانا صرف مشکل ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

جس طرح جب تک کوئی رقبۂ آراضی قبضہ میں نہ ہو اُس وقت تک کوئی ریاست یا حکومت وجود میں نہیں آسکتی اُسی طرح جب تک کسی انسانی جماعت کی زبان ایک نہ ہو اُس وقت تک اُس کو ایک قوم نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قوم بنانے کے لئے یا قومی اتفاق قایم رکھنے کے لئے ایک زبان کا ہونا ضروری ہے جسے ہم قومی ضرورت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

اب قومی تفاخر کو لیجئے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کی زبان سے زیادہ مانوس ہیں۔ اس میں جو لٹریچر ہے وہ ہماری دماغی کیفیات اور مذہبی خیالات کی جان ہے۔ اور ہمارے افعال کا رہنما ہے۔ ہماری زبان ہی سے ہمارے خاندان اور کنبہ کی جمعیت کا شیرازہ قایم ہے اور یہی ہم خیالی اور ہم آہنگی کا زبردست ذریعہ ہے۔ اسباب مذکور کی بنا پر ہم کو اپنی زبان بہت عزیز اور مرغوب ہے۔ اُس سے جدائی ہم ہرگز پسند نہیں کر سکتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر ہم ان جذبات اور خیالات کو ساتھ لیکر کسی زبان کے مسئلہ پر غور کرنے کی کوشش کریں گے تو کبھی صحیح نتیجہ پر نہ پہونچ سکیں گے۔

ہندوستان میں ہمیشہ سے یعنی جب سے ہندوستان کی تاریخ کا آغاز سمجھا جائے مختلف زبانیں رائج رہی ہیں۔ ابتداءً ڈراوڈ وغیرہ اقوام کی زبانیں مروج تھیں۔ بعد ازاں اُن زبانوں نے رواج پایا جو آریہ قومیں اپنے ساتھ لائیں۔ محققین کہتے ہیں کہ جب آریہ اقوام ہندوستان میں داخل ہوئیں تو اُن کی ایک خاص ادبی زبان تھی اور بہ لحاظ اس امر کے کہ اقوام مذکور متفرق فرقوں پر مشتمل تھیں اُن کی کئی عام بولیاں بھی تھیں جو ضروریاتِ روزمرہ کو پورا کرتی تھیں۔ وہ خاص ادبی زبان ویدوں کی زبان تھی۔ عام بول چال کی زبان بھاشا کہلاتی تھی۔

جس طرح ایران میں اوستی زبان اور قدیم فارسی زبان پہلوی وغیرہ زبانوں میں منتقل ہوگئیں اُسی طرح ویدی زبان امتدادِ زمانہ اور اپنی خصوصیات کی وجہ سے متروک ہوگئی اور اُس کی جگہ اُس بھاشا نے لی جسکو سنسکرت (نکھری ہوئی زبان) کہتے ہیں۔ جب سنسکرت اہل ادب اور اعلیٰ طبقہ کی زبان قایم ہوئی تو دیگر عام بولیاں پراکرت کہلائیں۔

ایک مدت کے بعد سنسکرت صرف کتابوں یعنی درس و تدریس کی زبان رہگئی اور پراکرت بولیاں جو اُسکی جلیں یا اُس سے ماخوذ تھیں مختلف رقبہ جاتِ ہند میں مختلف شکلوں میں رواج پاگئیں اور بطورِ خود مستقل زبانیں مثل بنگالی - گجراتی - مرہٹی - ہندی وغیرہ بن گئیں -

اس مقام پر اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زبانیں کیوں متروک ہوجاتی ہیں یعنی بول چال سے خارج ہوجاتی ہیں - سب سے بدیہی بات تو یہی معلوم ہوتی ہے کہ زبان الفاظ کے ثقل اور اُن کی ضخامت کو برداشت نہیں کرسکتی خواہ یہ کیفیتیں تکلم سے متعلق ہوں یا لہجہ سے یا کتابت سے - ثقیل اور ضخیم الفاظ یا تو استعمال کی کمی کی وجہ سے قطعاً متروک ہوجاتے ہیں یا جس طرح سنگریزے دریا میں لوٹتے پلٹتے چکنے اور صاف اور مختصر ہوجاتے ہیں اُسی طرح الفاظ مذکور کثرت استعمال سے گھس گھسا کر دوسری مختصر شکل اختیار کرلیتے ہیں - اس پر مستزاد نئے حالات جو نئی نئی باتوں کے لئے نئے نئے الفاظ ایجاد کرکے یا مستعار لیکر زبان میں اضافہ کردیتے ہیں - اس طرح پر پرانی زبان استعمال سے خارج ہوجاتی ہے اور ایک نئی طرح کی زبان جاری ہوجاتی ہے -

اُردو زبان بھی اسی طرح کی ایک نئی جاری شدہ زبان ہے - یہ ہندوستان کی ایک پراکرت زبان سے ماخوذ ہے اس امتیاز کے ساتھ کہ اُس کے الفاظ سنسکرت یا ہندی الفاظ کی مختصر یا صاف شدہ شکلوں پر مشتمل ہیں - چند الفاظ ملاحظہ ہوں :-

چندرا - چندرما = چاند ـــــ تارانیڑ = تراین ـــــ گرام = گانوں ـــــ سَرُوَ - سبہ = سب -

کشیتر = کھیت ـــــ سمہتیہ = سمیت ـــــ اَنّ آریہ = اناڑی

الفاظ کی اس صفائی اور اختصار کے متعلق دو رائیں قایم کی جاسکتی ہیں - ایک تو وہی کہ زبان خود نکھار اور ستھرا پن چاہتی ہے اس لئے یہ اختصار تلفظ اور کتابت کی سہولت کا ترقی یافتہ نتیجہ ہے - دوسری یہ کہ وہ اُس تنزل کی بیماری کا نتیجہ ہے جو اس زبان کو کسی وقت لاحق ہوئی - اِن رایوں کے قایم کرنے میں تعصب قومی کو کس قدر دخل ہوسکتا ہے ظاہر ہے -

بہرحال اُسکی شستگی اور اختصار کے علاوہ جن کو اصل زبان پراکرت نے قبول کیا نئے حالات کی بنا پر نئے محاورے نئے الفاظ صرف ایجاد ہی نہیں ہوئے بلکہ کثرت کے ساتھ اجنبی الفاظ ایران - توران اور عرب سے مستعار لئے گئے انگریزی سے بھی حال میں اسی طریق پر تھوڑا بہت استفادہ کیا گیا - اجنبی لوگ زیادہ تر ایران - افغانستان یا فارسی بولنے والے ترکستان سے آئے اس لئے زیادہ تر فارسی زبان ہی کے الفاظ اور ترکیبیں نئی زبان میں شامل کئے گئے اور جو واقعہ ایران میں پہلوی زبان پر گزرا جس سے پہلوی موجودہ فارسی بنی وہی مقامی پراکرت زبان پر ہندوستان میں ظہور پذیر ہوا - نئی زبان کا نام پہلے ہندی اور پھر جب فارسی عربی کی آمیزش زیادہ ہوگئی تو اُردو ہوا - چونکہ خود فارسی زبان عربی زبان سے مخلوط ہوگئی تھی اور عربی قواعد کی پابند ہوچکی تھی - نیز مسلمانوں کا مذہب عرب و عربی زبان سے وابستہ تھا اردو زبان میں بھی عربی آمیز فارسی شامل ہوگئی - ایرانیوں نے اگرچہ عربی مذہب اختیار کرلیا تھا - تاہم اُنھوں نے اپنی

بول چال میں اپنے سابقہ مذہب کی اصطلاحات کو برقرار رکھا اور اُن کے تخیل کا جولانگاہ بھی ایران ہی کا میدان رہا — کیونکہ اگرچہ وہ مسلمان ہو گئے تھے لیکن رہنے والے تو ایران ہی کے تھے۔

ہندوستان میں آنے والے مسلمان جو ہندوستان میں اُردو زبان کے پیدا ہونے کے باعث ہوئے، ہندوستان کے لئے اجنبی تھے۔ جس طرح مقامی ایرانیوں نے صوم۔ صلوٰۃ۔ مغفرت۔ اللہ۔ کو روزہ۔ نماز۔ بخشش اور یزداں و خدا میں منتقل کر لیا اُنھوں نے ہندوستان میں مقامی اصطلاحات کو قبول کرنے سے پرہیز کیا اور ہندوستان میں رہتے ہوئے اپنی تخیل کے گھوڑے بھی خیالی ایران و توران میں کُدواتے رہے۔ پوجا۔ اشنان جیسے معمولی لفظ مخصوص معنی لیکر رہ گئے اور عام مفہوم پیدا نہ کر سکے۔ اگر اُردو یہ تفریق نہ کرتی تو شاید وہ اپنے مادری ماخذ سے اتنی اجنبیت حاصل نہ کرتی جو اب اُس سے منسوب کی جاتی ہے اور اُس سے وہ مخصوص کیفیت پیدا نہ ہوتی جس کی بنا پر اُس کو مسلمانوں کی زبان کہا جاتا ہے۔

ایرانیوں نے صرف عربی زبان ہی کو اپنی زبان میں شامل نہیں کیا بلکہ عربی رسم الخط بھی قبول کر لیا۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ پہلوی رسم الخط کئی اعتبار سے بہت ناقص تھا مثلاً ایک حرف کئی اصوات کا مترادف تھا اور ایک ہی صوت کے کئی کئی حروف تھے۔ عبارت میں کسی سامی زبان کے لفظ لکھے جاتے تھے مگر اُن کی قرأت پہلوی الفاظ میں کی جاتی تھی۔ اس طرح کے رسم الخط کے جاری ہونے میں پوری پوری مدد کی۔ ہندوستان میں اسی میں سہولت دیکھی گئی کہ باہر والے جو رسم الخط استعمال کرتے ہوئے داخل ہوئے تھے وہی اولاً فارسی کتابت میں اور بعد میں اُردو کتابت میں قایم رہا اور مقامی حروف کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔

ایران کے حالات کا تو یہ نتیجہ ہوا کہ ایرانیوں کو اپنی مادری زبان سیکھنے کے لئے پہلے عربی زبان لازمی طور سے سیکھنا پڑی ہندوستان میں اُردو بولنے والوں کے لئے اپنی مادری زبان جاننے کے لئے فارسی اور عربی دو زبانیں سیکھنا پڑیں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ اُس بچہ پر کس قدر بار پڑتا ہے جب اُس کو دو غیر زبانیں سیکھنا پڑتی ہیں اور وہ بھی بہت اچھی طرح سے۔ اُنکے بعد تیسری زبان اور سر آن پڑی۔ اب غالباً چوتھی زبان کا نمبر ہے۔ بڑے غضب کی بات ہے کہ ہمارے بچوں پر اس قدر بوجھ ڈالا جائے اور ہم اُن سے یہ توقع کریں کہ وہ علوم کے حاصل کرنے میں جلد از جلد ترقی کریں۔

یہی کیفیت اُن ترکوں کی ہوئی جو ایران اور عراق ہوتے ہوئے ایشیائے کوچک میں آباد ہوئے۔ یعنی عربی کتابت کے استعمال اور عربی و فارسی زبان کے اشتمال سے وہ بھی مجبور ہوئے کہ اپنے بچوں کو ترکی زبان کے علاوہ فارسی اور عربی زبانیں سکھائیں۔

غیر زبان کے الفاظ کو مناسب طریق پر یا مناسب تعداد میں مستعار لینا اور اپنا کر لینا کوئی عیب کی بات نہیں ہے لیکن ایک چھوڑ دو دو زبانوں کو تمامی طور پر اپنی کتاب اللغات سمجھ لینا اور ڈکشنری بنا لینا بالکل دوسری بات ہے۔ اس کی خاص وجہ تو یہی معلوم ہوتی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے فساد اور اس کے بعد تک وہ لوگ جن کی بدولت اُردو جاری اور قایم ہوئی

فارسی کو بھی اپنی مادری زبان سمجھتے تھے - دفتروں کی زبان فارسی تھی - انگریزوں اور والیان ریاست کے درمیان معاہدے فارسی زبان میں تحریر کئے جاتے تھے - ہمیں یاد ہے کہ فساد کے عرصہ بعد تک ہمارے گھروں میں فارسی میں خطوط لکھے جانیکی تاکید تھی اور اُردو کی نسبت بقول مرزا غالب یہ سمجھا جاتا تھا کہ:-

آنکہ در گفتار فخر تست آں ننگ من ست

اس خیال کو کہ فارسی ہماری مادری زبان ہے فارسی طرزِ کتابت سے بڑی تقویت پہونچتی رہی اور اب بھی وہ سامی اور ایرانی تہذیب (Culture) کا اساس سمجھی جاتی ہے -

بہر حال اب تک جو ہوا اور جو اب ہو رہا ہے اُس کا صریحی نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے بچوں کا جسم دوہرے اور تہرے بوجھ سے دبا ہوا ہے اور دبتا چلا جاتا ہے - ظاہر ہے کہ حالاتِ موجودہ میں وہ پنپ نہیں سکتے - میرا تو یہی خیال ہے کہ مسلمانوں میں عام طور پر تعلیم اور علم کی کمی کی یہی خاص وجہ ہے کہ اُن کو اپنی زبان سیکھنے کے لئے دو دو تین تین زبانیں سیکھنا ضروری تھا اور ہے -

غور کرنا چاہئے کہ آیندہ نسلوں کی بہتری کے لئے ہم اُن کا بوجھ کم کرنے کی کچھ فکر کر سکتے ہیں یا نہیں - اگر کر سکتے ہیں تو کس طریق پر -

ایک بات جو دھیان میں آتی ہے یہ ہے کہ عربی اور فارسی زبانوں کی جو لامحدود ڈکشنریاں ہمارے پیشِ نظر ہیں اُن کا دروازہ بند کیا جائے اور خود اپنی زبان کی لغات طیار کی جائیں - یہ لغات صرف ہندی بول چال کے الفاظ و محاورات تک محدود نہیں ہونا چاہئیں بلکہ اُن میں فارسی، عربی وغیرہ کے وہ الفاظ و محاورات بھی شامل ہونا چاہئے جو ہمارے روزمرہ اور عام بول چال میں داخل ہیں - مگر سوال یہ ہے کہ ایسی ڈکشنریاں کس طرح سے بن سکتی ہیں - کہدینا تو بہت آسان ہے لیکن کرنا بہت مشکل ہے - پھر بھی غور کرنے سے یہ بات ظاہر ہوگی کہ ایسی ڈکشنری اُس وقت طیار کی جانی ممکن ہے جب ہم اپنا رسم خط بدلنے پر آمادہ ہوں -

ترکوں کی یہ ہمت اور جرأت قابل اعتراف ہے کہ اُنھوں نے ترقی تعلیم کے لئے عربی رسم الخط کو ترک کر کے ایسا رسم الخط اختیار کیا جو اُن کو غیر زبان سیکھنے پر مجبور نہیں کرتا - جو رسم الخط اُنھوں نے اختیار کیا اگرچہ ایک اعتبار سے بہت ناقص ہے تاہم بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے - خواہ کوئی ترکی زبان سے واقف ہو یا نہ ہو وہ ہر جگہ پڑھا جا سکتا ہے - اگر ترکی زبان سے کوئی واقف ہے تو معنی بھی سمجھ سکتا ہے - اس رسم الخط کا سب سے بڑا جو نقص ہے وہ یہ ہے کہ وہ صحیح تلفظ کا ذمہ دار نہیں - تلفظ کا دارومدار روایت اور یادداشت پر رہتا ہے - یہ رسم الخط رومی حروف پر مشتمل ہے اور ہندوستانی فوجوں میں مقامی زبانوں کے لئے استعمال میں لایا بھی گیا ہے -

ہندوستان میں سب سے زیادہ صاف ناگری حروف تہجی ہیں - ان حرفوں میں خواہ کسی زبان کا لفظ ہو، تلفظ کی صحت

کے ساتھ لکھا پڑھا جا سکتا ہے - یہی اس کی خوبی ہے لیکن اسی کے ساتھ اگر یہ کامل احتیاط کے ساتھ نہ لکھا جائے یعنی اُس طرح سے نہ لکھا جائے جیسا چھاپہ میں چھپتا ہے تو رواں نہیں پڑھا جا سکتا - اور جب احتیاط سے لکھنا ہو تو وقت زیادہ لیتا ہے اور جگہ بھی - غالباً اِسی نقص کی وجہ سے یہ رسم الخط ہندوستان میں عام طور پر بجز طریق خوشخطی یا طباعت رواج نہ پا سکا بلکہ ہر مقام پر بگڑ بگڑ کر کہیں بنگالی - کہیں گجراتی - مارواڑی - مراٹھی وغیرہ رسم الخط بن گیا جو ایک دوسرے سے اسقدر مختلف ہیں کہ ایک کا جاننے والا دوسرے کو نہیں پہچان سکتا - ان سب خطوں کی خصوصیت یہ ہے کہ حروف ملا کر لکھے جاتے ہیں جو ناگری حروف کے اصل صورت میں استعمال سے ناممکن تھا - اس وجہ سے ناگری رسم الخط ہندوستان کے ایک حصہ کے رسم الخط ہونے کی حد سے آگے نہ بڑھ سکا اور جس طرح سنسکریت کتابی زبان رہ گئی اُسی طرح ناگری حروف بھی اُسی زبان کی عام کتابی کتابت رہ گئی -

اگر بالفرض اُردو باوجود نقایص مذکور کے ناگری حروف اختیار کرنے کا ارادہ کرے تو اُس کے اس قصد میں ایک بڑی دقت یہ رونما ہو گئی ہے کہ ہندی کی اشاعت کرنے والے جذبۂ قومی سے سرشار ہو کر ہندی کے اُس حصہ کو بھی جو اُردو میں شامل ہے اور جس پر اُردو مبنی ہے اور جو اُردو کی جان ہے متشکل پشکل قدیم کر رہے ہیں اور یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو گا کہ دراصل سنسکرت زبان کو پھر تازہ کر رہے ہیں - مذہبی اور قومی جوشش جذبات اُن کو اس بات پر غور کرنے کی اجازت نہیں دیتی کہ اس وقت جس زبان کو وہ - اُن کے گھر والے - اُن کے احباب اور اعزہ اُٹھتے بیٹھتے ہر وقت بولتے ہیں اور جو اسوقت تک اُنکی مادری زبان سمجھی جاتی رہی ہے اُس کو ترک کر کے یا اُس کے علاوہ خالص سنسکرت الفاظ کی بھرتی کریں گے تو اُن کو بھی عام بول چال کے علاوہ ایک قدیم کتابی زبان سیکھنا پڑے گی - اُن کا یہ عذر بہت صحیح اور درست ہے کہ اُردو کی موجودہ شکل و صورت میں وہی وقت اس وقت بھی اُن کو لاحق ہے اور اس لئے عربی اور فارسی سیکھنے کے بجائے اُن کا سنسکرت سیکھنا قابلِ اعتراض نہیں ہو سکتا - ہمارے نزدیک اس عذر کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا جا سکتا - اگر اس کے متعلق کچھ کہا جا سکتا ہے تو صرف اس قدر کہ ہندو اور مسلمان دونوں ہندوستانی قومیت رکھنے والے ہیں - بستیوں میں ایک دوسرے کا پڑوسی ہے - روزمرہ کے کاروبار میں ایک دوسرے کا ساتھی ہے اور ایک ہی بولی سے کام نکل رہا ہے - پس اگر اُس بولی کو چھوڑ کر اصل کی طرف رجعت کی جائے گی خواہ وہ ترکی فارسی ہو یا سنسکرت تو اُس سے تفریق کُلّی ہو جائے گی - اس تفریق کی ابتدا اکثریت کے رنگ میں - مذہبی جوش کے اُبال میں - گزشتہ ایام میں کچلی ہوئی اور دبی ہوئی قومی اور انفرادی امنگوں کے اُبھار میں اور آزادی کی بیباکی میں ہو چکی ہے - اگر حکومت کے سیاسی نقطۂ نظر سے بھی اس تفریق کا اتمام کو پہونچنا ضروری ہے تو یہ بات ہی اور ہے ورنہ صلح و آشتی کا طریقہ یہ ہو گا کہ فریقین ایسی تجویز سوچیں جس سے ایک ہی بولی قایم رہے اور وہ بولی بطور خود ایسی مستقل صورت قبول کرے جس سے واقف ہونے کے لئے کسی دوسری زبان سیکھنے کی ضرورت نہ رہے - مگر صلح و آشتی کی ضرورت ہی کیا ہے - ہر جماعت اور ہر حکومت وہی زبان چاہے گی جس کو وہ خاص اپنا سمجھتی ہے

یہ بات کہنے کی نہ تھی لیکن کہی جا چکی ہے کہ مسلمانوں کی حکومت میں فارسی - انگریزوں کے دور میں انگریزی سیکھنی ضروری تھا اب جس جماعت کی حکومت کا دور ہے اُس کی زبان سیکھنی ہوگی - ایسی صورتوں میں ایک کمزور اور دبا ہوا شخص ہی صلح و آشتی کی التجا یا آرزو کر سکتا ہے - ایک مکمل جماعت کو جو اپنی تمام ضروریات پر حاوی ہو بیرونی الحاق و امداد کی ضرورت یا پروا کیا ہو سکتی ہے - اکثریت اور اقلیت کی شکل اب یوں واقع ہو گئی ہے جیسے کوئی غریب اور مفلس آدمی کسی مالدار اور ذی رتبہ شخص سے اپنی رشتہ داری کا اظہار کرے محض اس غرض سے کہ اُس کی بھی کہیں پرسش ہو جائے اور شخصِ مذکور اُس بیچارے کی ہستی اور موجودگی سے بیزار نہ سہی تو مستغنی نہ ہو -

بفرض اگر مصالحت و موانست کا دروازہ کھلا ہوا سمجھا جائے تو موجودہ زبان کو قایم رکھنے کے لئے تجویز وہی ہو سکتی ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے یعنی رسم الخط کا تبدیل کر دینا یا اُردو کے موجودہ رسم الخط میں اصلاح کرنا - جدید حروف یا ترمیم شدہ حروف ایسے ہونا چاہئے جو لپٹو ان بھی لکھے جا سکیں اور جو صحیح تلفظ کے بھی ذمہ دار ہوں -

موجودہ حالات عیسیٰ بدینِ خود اور موسیٰ بدینِ خود کی طرف جا رہے ہیں - پس متفقہ نئے یا اصلاح شدہ حروف کا ایجاد ہونا یا قبول کیا جانا از بس مشکل یا قطعی محال نظر آتا ہے - البتہ اگر حامیانِ اُردو موجودہ رسم الخط کے اصلاح کی طرف محض اپنی آیندہ نسلوں کی بہتری کے لئے توجہ دیں اور جرأت ترکانہ سے کام لیں - نیز اپنی اُس جذباتی تخئیلی کی ترمیم کے لئے آمادہ ہوں جو سامی یا ایرانی کلچر سے وابستہ ہے تو بھی کچھ ہو سکتا ہے -

اصلاح کا طریقہ یہ ممکن ہے کہ اُردو کے حروف تہجی میں سے جتنے ہم آواز حروف ہوں اُن میں سے صرف ایک ایک قایم رکھا جائے - اپنی زبان کی اغراض کے لئے ث - س - ص - کو ہم آواز سمجھنا چاہئے - حروف علت کو طویل الصوت قرار دیکر اور حرکات خفیف زیر - زبر - پیش کو ناگری حروف کی ماتراؤں کی طرز پر حروف کا جزو قایم کر کے یا علٰحدہ طریق پر قایم کر کے اصلاح کی جائے - اضافت اگر ترک نہ ہو سکے تو اسی طرح اُس کا بھی انتظام کیا جائے -

اس اصلاح کے بعد اُردو زبان یا ہندوستانی زبان کی ڈکشنریاں طیار کی جائیں - اُن میں وہ سب الفاظ شامل کر لئے جائیں جو اس وقت عام بول چال میں داخل اور شامل ہیں خواہ وہ کسی اور زبان کے ہوں - جو الفاظ محض کتابوں میں پائے جاتے ہیں اور عام بول چال یا روزمرہ میں داخل نہ ہوں متروک کر دئے جائیں - کامیابی کی تو اُسی وقت امید کی جا سکتی تھی جب حکومت یا فریقین متفقہ طور پر اس قسم کی کسی تجویز پر عمل کرنے کو طیار ہو سکتے تھے لیکن اگر ایک ہی فریق اس کام کو شروع کرے تو بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے -

ح - ا

مذہب اور فلسفۂ مذہب

دونوں معہ محصول دو روپے میں

مینجر نگار

مجمع یا بھیڑ

(نفسیاتی نقطۂ نظر سے)

نفسیات کی دنیا میں "مجمع بھیڑ یا انبوہ" کو خاص اہمیت دی جاتی ہے - عوام کا مجمع افراد کی علٰحدہ علٰحدہ خصوصیات کے علاوہ بعض ایسی خصوصیات بھی رکھتا ہے جو فرداً فرداً ہر شخص میں نہیں پائی جاتیں - لیکن قبل اس کے کہ ہم مجمع کی "نفسیات" سے بحث کریں، ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ "مجمع" کی صحیح تعریف کیا ہے اس کی فطرت کیا ہے اس کی خصوصیات کیا ہیں اور اس سے کس قسم کے افعال کا ارتکاب ہو سکتا ہے -

مجمع عام طور پر افراد کی ایک کثیر تعداد کو کہتے ہیں، جو ایک جگہ جمع ہو جائے، لیکن نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے صرف افراد کی تعداد ہی کافی نہیں ہے اور نہ سڑکوں پر چلنے پھرنے والے لوگ جو شہروں میں ہر جگہ دیکھے جا سکتے ہیں "مجمع" کی تعریف میں آتے ہیں - نفسیاتی نقطۂ نظر سے بحث کرنے کے لئے ان میں مشترک مقصد کا ہونا بھی ضروری ہے اور صرف مقصد ہی نہیں بلکہ اس مقصد کے ساتھ اُن کا عمل اور ردعمل بھی ہونا ضروری ہے - افراد کا اجتماع کسی خاص مجلس یا نظام کی زیر نگرانی بھی ہو سکتا ہے لیکن نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے ہم جس مجمع کا ذکر کرتے جا رہے ہیں اس کو ہم "بھیڑ" سے بھی موسوم کر سکتے ہیں -

یکجا چائے پینے، طالب علموں کے دارالعمل میں کام کرنے، کسی محکمہ کے عملے کی یکجا کانفرنس کرنے اور اسی قسم کی دوسری منظم جماعتوں کی حرکات کو مجمع کی حرکات سے ہم تعبیر نہیں کر سکتے - اسی طرح افراد کی ایک جماعت جو اخبار پڑھ رہی ہو، ریڈیو سُن رہی ہو یا فوجی کارروائیوں میں مصروف ہو، بھیڑ نہیں کہی جا سکتی -

بھیڑ کی خاص خصوصیات اس کی عارضی یکجائی، متلون مزاجی اور ایک مشترک نقطۂ نگاہ کا ہونا ہے - کسی بھیڑ کے افراد کے اعداد کا تعین صحیح صحیح نہیں کیا جا سکتا کہ کم سے کم اتنا یا زیادہ سے زیادہ اتنا ہو - تعزیرات ہند نے مجمع کی تعریف پانچ یا پانچ سے اوپر افراد پر مشتمل جماعت کی بتائی ہے لیکن اس کو ہم کلیہ نہیں قرار دے سکتے، میرا ذاتی خیال ہے کہ افراد کا کوئی بھی اجتماع جب تک وہ اپنے مخالفین پر رعب ڈالتے، خوفزدہ کرنے اور غالب آنے کی خصوصیات نہ رکھتا ہو مجمع نہیں کہلایا جا سکتا یہ خصوصیات یقیناً افراد کی حیثیت پر منحصر ہوتی ہیں مثلاً چند درجن منتخب پہلوانوں کا مجمع اپنے اندر سیکڑوں پر غالب آجانے کی

قوت کا احساس کر سکتا ہے، اسی طرح اچھوتوں کا ایک کثیر مجمع، اجتماع روباہاں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھ سکتا۔ بھیڑ کے اندر بہر صورت جوش و خروش کا پایا جانا ضروری ہے اور اپنی مشترکہ قوت کا احساس بھی۔

عام حالات میں مجمع کے ایک حصے کے لوگ بہت زیادہ جوشیلے ہوتے ہیں اور اپنے سے کم جوشیلے و مشتعل افراد کو ہٹا کر ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے یہ چیز بہت ضروری ہے کیونکہ اس سے جوش بڑھتا ہے اور قوت کا احساس قوی سے قوی تر ہوتا جاتا ہے۔

فطرتاً کسی مجمع کے افراد ٹھنڈے دل سے سوچنے سمجھنے اور کسی کی تقریر سننے کے متحمل نہیں ہوتے وہ کام کرنا چاہتے ہیں خواہ اس کے نتائج اچھے ہوں یا بُرے۔ چنانچہ سننے کی زحمت وہ اسی وقت گوارا کرتے ہیں جب جذبات کی فراوانی اپنے انتہائی نقطۂ عروج پر پہونچ جائے، اس کی عجیب صورت ہوتی ہے۔ چنانچہ جونہی ان کو ایک مشترکہ مقصد مل جاتا ہے وہ فوراً اس کی تکمیل کے ذرائع ڈھونڈتے ہیں اور تمام مزاحمتوں کو کچلنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور انتہائی سرد مہری اور سنگدلی سے وہ حرکات کر گزرتے ہیں جن کا ارتکاب ان میں سے فرداً فرداً کوئی نہ کر سکتا، لیکن اسی کے ساتھ وہ جلدی خوفزدہ بھی ہو سکتا ہے، چنانچہ پولیس کے لاٹھی چارج وغیرہ کے سلسلہ میں بے تحاشا بھاگنے کے جو مظاہرے نگاہوں کے سامنے آتے ہیں وہ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں اس وقت فہم و فراست ختم ہو جاتی ہے اور انسان جانور ہو جاتا ہے، مجمع کی اس خاص حالت کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ایک تو اس کا جارحانہ رجحان اور دوسرا خوفزدہ ہو کر سراسیمگی کے عالم میں راہ فرار اختیار کرنا۔ یہ دونوں حالتیں اتنی عام ہیں کہ آسانی سے دیکھی جا سکتی ہیں۔ جارحانہ رجحان کی بہترین مثالیں ہندوستان نے فرقہ وارانہ فسادات کے زمانہ میں پیش کی ہیں۔ دوسری حالت کا اظہار ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی جگہ اقلیتوں کی طرف سے ہوا ہے، ابھی حال ہی میں مجھے اس حالت کے مطالعہ کرنے کا موقع کمیونسٹ طلبہ کی ایک جماعت کے پولیس کے آجانے پر بھاگنے سے ملا۔ حالانکہ وہ اس کا اقرار نہیں کرتے اور دوسری توجیہات پیش کرتے ہیں۔

مجمع میں جارحانہ رویہ اس صورت میں پیدا ہوتا ہے جبکہ اس کو اپنی جان مال یا آبرو کی فکر ہوتی ہے۔ افریقہ میں ہندوستانیوں اور حبشیوں کے مابین جو جنگ حال ہی میں ہوئی اس کا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ حبشیوں کو یہ یقین دلایا گیا کہ ہندوستانیوں کی موجودگی میں اُن کی یہ تینوں چیزیں جان مال اور آبرو خطرے میں ہیں۔

مجمع میں سراسیمگی کے آثار اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب افراد کو اپنی شکست کا احساس پیدا ہونے لگے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ سبھی اس جذبے سے متاثر ہوں البتہ یہ ضرور ہے کہ چند کو بھی اس کا احساس شدت سے ہو تو دوسرے بھاگنے میں اُن کی تقلید کریں گے۔ انسان فطرتاً نقال ہوا ہے ——— چنانچہ

تاریخ میں اس قسم کی مثالیں بہت ملتی ہیں۔ مثلاً نپولین نے جب دوبارہ فرانس کی طرف مراجعت کی تو اسے بجائے فوج کی استمالت کرنے کے تن تنہا خود کو اپنی پرانی فوج کے سامنے جو اس وقت لوئیس سپہ سالاروں کی ماتحتی میں تھی پیش کیا۔ اس کے الفاظ تھے

کہ تم میں سے کون ایسا ہے جو اپنے شہنشاہ کے سینے پر گولی چلائے گا۔" ان الفاظ نے طلسم کا سا اثر کیا اور جذبات سے مغلوب ہو کر ایک سپاہی نے اپنی بندوق نیچی کر لی اس کو دیکھ کر دوسرے نے تقلید کی اور ساری کی ساری فوج نے بندوقیں نیچی کر لیں اور شاہی سپہ سالار بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ ان مثالوں سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مجمع میں نقالی کی عادت چھوت کی بیماری سے مشابہ ہوتی ہے اور آناً فاناً کسی شخص کا ایک فعل دوسروں کو بھی تقلید پر مجبور کر دیتا ہے۔

بھیڑ یا مجمع کے افراد کی کیفیت بعض اوقات مسحور شخص کی سی ہوتی ہے۔ جس طرح مسحور ساحر کے اشارات اور احکام کا تابع ہوتا ہے اسی طرح مجمع اپنے لیڈر کے احکام کا مطیع ہوتا ہے اور اس وقت وہ لیڈر کی ذرا سی مرضی سے ایسے کام کرنے پر اتر آتا ہے جو عام حالات میں اس سے کبھی ظہور میں نہ آسکتے، مثلاً سنجیدہ سے سنجیدہ آدمی ایسے نعرے لگانے پر مجبور ہوتا ہے جس کو اس کی زبان تنہائی میں بھی ادا نہیں کر سکتی۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس کو اپنے افعال اور حرکات پر قابو باقی نہیں رہتا وہ صرف اعصابی حرکات کا مطیع ہوتا ہے اور اس کا ہر فعل اضطراری ہو کر رہ جاتا ہے۔ انگریزی ادب میں "مجمع کی نفسیات" کی بہترین مثالیں شیکسپیر کے مقبول ڈرامے جولیس سیزر میں انٹونی اور بروٹس کی تقریروں اور ان کے اثرات میں پائی جاتی ہیں۔ دونوں ہی مجمع کے جذبات سے کام لیتے ہیں اور اس طرح اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

مجمع یا بھیڑ کی طاقت کا اظہار اور اس کی دہشت انگیزی اسوقت اور زیادہ ہو جاتی ہے جب اسکی جبلی خصوصیات مثلاً خوف، تعجب اور لڑائی بھڑائی کی فطری خواہش کے علاوہ اس میں حق پرستی وغیرہ کا بھی اضافہ ہو جائے۔ علاوہ اسکے لوگوں کا ایک دوسرے سے مل کر کھڑے ہونا، شانوں سے شانہ رگڑتے ہوئے بڑھنا، آپس میں گفتگو کرنا بھی اُن کے اشتعال کو تیز سے تیز تر کرتا ہے۔

ایک مشتعل مجمع کے لئے لیڈر یا لیڈروں کا ہونا اشد ضروری ہے، اکثر یہ ہوتا ہے کہ لیڈر ہنگامی حالات کی پیداوار ہوتے ہیں۔ مجمع کو صرف اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی شخص اُن کے جذبات سے اپیل کرے، ان کو ایک مرکز پر لا سکے اور پھر اس کے بعد انھیں اس سے بحث نہیں ہوتی کہ وہ سوسائٹی کے کس طبقہ سے تعلق رکھتا ہے اکثر ایسے لیڈر نیچے طبقہ کی پیداوار ہوتے ہیں۔

(Action Crowd) جس کو ہم "عملی مجمع" کہہ سکتے ہیں۔ تحت الشعور کی خواہشات کے ماتحت جلد مشتعل ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک فرقہ کی دوسرے فرقے سے جنگ کسی معمولی واقعہ سے شروع ہوتی ہے اور پھر آگے بڑھ کر خطرناک صورتیں اختیار کر لیتی ہے اور تحت الشعوری خواہشات کو اُبھرنے کا ذریعہ میسر آجاتا ہے۔ مشتعل مجمع کو قابو میں لانے کی بہترین صورت اس کے سامنے پر مذاق اور خوشگوار واقعات کا ذکر کرتا ہے۔

پروفیسر فرائیڈ نے اپنی تصنیف گروپ سائیکولوجی میں مجمع کے متعلق تین سوالات سے بحث کی ہے۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ مجمع کیا ہے؟ یعنی اس کی صحیح تعریف کیا ہے، یہ کس طرح اپنے افراد کی دماغی کیفیات کو تبدیل کرتا ہے اور آخری تیسرا سوال یہ ہے کہ کیا گیا تبدیلیاں افراد کے دماغ میں رونما ہوتی ہیں۔

سوال نمبر ایک سے ہم بڑی حد تک عہدہ برا ہو چکے ہیں، اب رہے بقیہ دونوں سوالات اس میں نمبر دو کے متعلق یہ کہنا ہے کہ یہ حقیقت ہے کہ افراد کے دماغ میں زبردست تبدیلیاں ہو جاتی ہیں اور ان سے ایسے افعال کا ارتکاب ہوتا ہے جو عام حالات میں ناممکن ہوتا۔ یہ تبدیلیاں صرف اس وجہ سے ہوتی ہیں کہ وہ مسحور ہو کر اپنی تنقیدی قوت کھو بیٹھتا ہے اور جب اس کی دماغی سطح نیچی ہو جاتی ہے تو پھر اس میں ساری وحشیانہ خصوصیات عود کر آتی ہیں، چنانچہ اس کا نتیجہ وہ ہوتا ہے جو اکثر لوگوں کی نگاہ سے گزرا ہوگا۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ لیبان ماہر نفسیات کا خیال ہے کہ مجمع میں ہپناٹزم ( ) کی کیفیات پائی جاتی ہیں یعنی وہی شعور کا انحطاط اور لاشعور کا ابھرنا۔

گروپ یا مجمع کی اخلاقی حالت پر تنقید کرتے ہوئے ہمیں یہ چیز ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ جب افراد مجمع میں داخل ہوتے ہیں تو ان کی تنقیدی قوتیں یا ضمیر کا فعل ختم ہو جاتا ہے۔

گروپ کی ایک اور خصوصیت اس کا حقایق سے گریز ہے وہ محض فریب و تخیل کی دنیا میں رہنا چاہتا ہے اور اس کی حالت ایک مجنوں یا ہسٹیریا کے مریض کی سی ہوتی ہے۔

لیبان کے نزدیک خیالات اور لیڈر دونوں میں ایک پراسرار قسم کی طاقت ہوتی ہے اس طاقت کو وہ Prestige سے موسوم کرتا ہے۔ اسی Prestige کی بدولت گروپ لیڈروں کے اشارہ پر عمل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ Prestige قوائے تنقید کو بالکل ضعیف کر دیتا ہے اور افراد میں تعجب کی ایک لہر دوڑا کر ان کو اطاعت کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ افراد پر ان اثرات کی علامات بجنسہٖ ہپناٹزم سے ملتی جلتی ہیں۔

لیبان کی یہ خوش نصیبی ہے کہ فرائیڈ نے اس کے اصولوں کو دیباچہ کے طور پر اپنی تصنیف کے ابتدائی اوراق میں استعمال کیا ہے، حقیقتاً لیبان کے بتائے ہوئے اصولوں میں کوئی نئی بات نہیں کہی گئی ہے جو اوروں نے نہ کہی ہو یہی نکات میڈوگل نے اپنی کتاب (Group mind) میں پیش کئے ہیں اور ان خطرناک حالات پر قابو پانے کا طریقہ منظم جماعت بندی (Organization) بتایا ہے۔

مجمع یا گروپ کی ایک خاص خصوصیت افراد کے جذبات کی فراوانی ہے جو ان کے دماغوں کو بلند کر کے عرش معلی تک پہونچا دیتی ہے اور وہ خود کو ناقابلِ تسخیر قوت و عزم کا مالک تصور کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ میڈوگل کے نزدیک جذبات کی یہ فراوانی عام حالات میں قطعاً ناممکن ہے۔ گروپ کے وہ افراد جو فطرتاً دل کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں اس نفسیاتی

کیفیت سے بنایت لطف اندوز ہوتے ہیں وہ اپنی انفرادیت کھوکر ایک عجیب لذت و تسکین محسوس کرتے ہیں۔ جن حالات میں انفرادیت اجتماعیت میں مدغم ہوتی ہے اس کو میڈوگل نے جذبات کی لہروں کا دوسرے افراد تک منتقل ہونا ظاہر کیا ہے اس کا کہنا ہے کہ اگر ہم کسی ایسے شخص کو دیکھیں جس پر جذبات طاری ہوں تو فطری طور پر ہم اُن جذبات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

میڈوگل نے مجمع یا گروپ کی اجتماعی کیفیت کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس میں اور لیبان کے بیان میں سر مو اختلاف نہیں ہے۔ دونوں ماہرین کے نزدیک مجمع اشتعال انگیزی، دہشت پسندی اور وحشیانہ جذبات کا شکار ہوتا ہے۔ خفا ہونا اور پھر خفا ہوکر جلد ہی من جانا اس کی خاص خصوصیات ہوتی ہیں۔ عقل و خرد کے چھن جانے کے باعث اور اپنی عظیم طاقت کے گمان میں وہ سب حرکتیں سرزد کرسکتا ہے جو کسی مطلق العنان اور خود سر حکمراں سے سرزد ہوسکتی ہیں، غرض کہ مجمع کی ساری خصوصیات، اپنے افراد کی خصوصیات سے مل کر کسی شریر بچے یا وحشی کی دماغی کیفیت سے ملتی جلتی ہیں۔

میگڈوگل مجمع کی اس مشتعل اور غیر عاقلانہ روش کو بلند کرنے کے لئے پانچ شرایط پیش کرتا ہے، ان شرایط کی موجودگی میں گروپ کی بڑھی ہوئی طاقت کا استعمال بھی ہوجاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی خطرناک ذہنیت کی ہلاکت آفرینی بھی بڑی حد تک کم ہوجاتی ہے۔ پروفیسر موصوف کی اولین شرط گروپ کی زندگی میں ایک تسلسل کا ہونا ہے یعنی گروپ کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ کسی نہ کسی صورت میں اس کی زندگی طویل ہوجائے اور اس طرح ناگہانی طور پر یکجائی کی حیثیت ختم ہوجائے دوسری شرط یہ ہے کہ گروپ کے ہر فرد کو گروپ کی کارروائیوں اور اس کے افراد کے اختیارات وغیرہ کے بارے میں مفصل معلومات ہوں تاکہ وہ خود کو جذباتی طور پر ہر فرد سے وابستہ کرسکے، تیسری شرط یہ ہے کہ گروپ کو اور دوسرے منظم اداروں کی موجودگی کا احساس دلایا جائے تاکہ مقابلہ کی اسپرٹ پیدا ہوکر افراد کا باہمی ارتباط ترقی کرجائے۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ گروپ کی کچھ روایات ہوں کچھ رسوم ہوں اور کچھ پابندیاں ہوں جن پر ہر فرد عامل ہوسکے اور اپنے تعلقات کو دوسرے ممبران سے استوار کرکے درجہ بندی قایم کرے۔ پانچویں شرط یہ ہے کہ گروپ کا قیام کچھ خاص بنیادی اصولوں پر ہو جن کی پابندی ہر فرد پر لازم ہو اور ہر فرد کے افعال و حرکات اور اختیارات کی صحیح صحیح وضاحت کردی جائے۔ میگڈوگل کا خیال ہے کہ اگر ان شرایط کو پورا کیا جائے تو گروپ کی خرابیاں دور ہوجائیں گی اور وہ اپنی طاقت کا بیجا استعمال نہ کریں گے۔ دماغی اور ذہنی سطح کے بلند کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اُن کو مجموعی طور پر دماغی کاموں سے باز رکھا جائے اور اگر ایسے کام آہی پڑیں تو اسکو علٰحدہ علٰحدہ افراد کے سپرد کیا جائے۔ فرائڈ کا خیال ہے کہ میگڈوگل کے پیش کردہ نظریہ کو دوسرے طریقہ پر بھی بیان کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ میڈوگل صرف یہی چاہتا ہے کہ گروپ کو افراد کی خصوصیات دیدی جائیں اور ہر شخص کو معلوم ہے کہ علٰحدہ علٰحدہ ہر فرد کی زندگی میں تسلسل ہوتا ہے، خود شناسی ہوتی ہے کچھ رسم و رواج ہوتے ہیں جن پر وہ عامل ہوتا ہے، لیکن ان تمام خصوصیات کا ازالہ اسی وقت ہوجاتا ہے جب وہ گروپ میں داخل ہوتا ہے۔ اور اس طرح اگر ہم یہ نتیجہ نکالیں کہ گروپ میں ہو بہو افراد کی خصوصیات پیدا کی جاسکتی ہیں تو ہم غلطی کا ارتکاب کریں گے اس لئے کہ بقول فرائڈ افراد حیوانیاتی اصول کے ماتحت گروپ میں داخل ہوتے ہیں اور اُن کو گروپ میں داخل ہونے سے روکنا اور داخل ہوجانے کے بعد اس کی خرابیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کرنا فطرت سے جنگ کے مترادف ہوگا۔"

(پروفیسر) جلیل احمد

گھریلو گیت

اُردو شاعری دربار سے وابستہ ہونے کے بعد اس میں شک نہیں بہت نکھر گئی اور پڑھے لکھے طبقہ میں بہت مقبول ہوئی لیکن عوام کی شاعری کا طرز ادا وہی رہا۔ اس کے تشبیہ و استعارے بھی ویسے ہی سیدھے سادے قایم رہے۔ اس میں شک نہیں غزل میں بلا کی رومانیت ہوتی ہے لیکن غزل کی رومانیت وہ ہے جو معاشی اطمینان حاصل ہونے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ غزل کی رومانیت عوام کے کام کی نہیں کیونکہ اس کی رنگینیوں سے محظوظ ہونے کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہماری روح اور ہماری تخئیل غیر معمولی پرواز کی اہلیت رکھتی ہو۔ برخلاف اس کے عوام کا رومان بھی حقیقت کی بنیادوں پر قایم ہوتا ہے اور اسی لئے گیت میں رومان بھی ہے۔ حقیقت کی تلخیاں بھی۔ سوسائٹی کے روشن پہلو بھی ہیں اور تاریک بھی۔ اس کے علاوہ گیتوں کی بڑی خصوصیت جو ادب کی کسی اور صنف میں نہیں ملتی وہ ان کی جمہوریت ہے اور مذہب، علم، دولت اور حکومت نے جو فرق مراتب قایم کر رکھا ہے، گیت اس سے گرانبار نہیں ہیں۔

اب ہم مختلف عنوانات کے تحت گیتوں پر نظر ڈالتے ہیں، لیکن یہ کبھی نہ بھولنا چاہیئے کہ گیتوں کا لطف ان کے پڑھنے میں نہیں بلکہ گانے میں ہے جو قلم سے ظاہر نہیں ہو سکتا۔

زچہ خانے کے گیت — یہ سوہر بھی کہلاتے ہیں یہ گیت بچہ ہونے کے دن سے چھٹی تک گائے جاتے ہیں۔ زیادہ تر گھر کی عورتیں ہی گاتی ہیں لیکن کہیں کہیں مراثنیں۔ حلال خوریاں اور دائیاں بھی گاتی ہیں۔ اس میں کوئی گیت ماں کی طرف سے ہوتا ہے کوئی نانی کی طرف سے کوئی لڑکے کی طرف سے اور کوئی گھر والوں کی طرف سے۔ مندرجہ ذیل گیت بہن کی طرف سے ہے جو بھائی کے گھر لڑکا ہونے کا شور سنکر چڑھاوا لیکر آتی ہے اور نہایت محبت بھری ضد سے نیگ میں کٹوری، روپیہ، گھوڑا، زیور، غلام سب ہی کچھ مانگ رہی ہے:-

۱- بیرن بھیّا میں تیری ماں جائی ہولڑ (شور) سنکر بدھاوا لیکر آئی
چھاتی دُھلائی کٹوری لوں گی تولٹ دُھلائی روپیّا
پاؤں دھلن کو چیری (لونڈی) لوں گی تو پیا چڑھن کو گھوڑا
بیرن بھیّا میں تیری ماں جائی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ایک اور گیت ملاحظہ ہو جو غریب طبقہ کا ہے۔ اس گیت میں ایک غریب زچہ اپنے میاں سے اس لئے روٹھی ہے کہ آرام و

استراحت کے سامان مہیا نہیں - شوہر نہایت دلجوئی سے کہتا ہے :-

۲- کہو تو چچا رانی دائی کو بلا دوں
کہو تو کونے پلنگ بچھا دوں
چچا رانی کاہے کو روٹھی

اس پر غالباً اس نے کہا ہوگا - پلنگ ولنگ کیسے - تم تو سونٹھ تک نہیں لائے یہ سنکر وہ کہتا ہے :-

سونٹھ میں بھول گیا - اب لادوں گا جی

۳- یہ گیت خود زچہ کی طرف سے ہے جس میں اس نے اپنے ارمان ظاہر کئے ہیں اس کا ثبوت ہیں کہ اور بھی اسکے ساتھ ساتھ اس خوشی میں شریک ہیں :-

ایلیلے نے مجھے درد دیا سانولیا نے مجھے درد دیا
جائے کہو لڑکے کے باوا سے اونچی نوبت دھراؤ رے
جائے کہو لڑکے کے نانا سے رنگ بھری کھچڑی لاؤ رے
جائے کہو لڑکے کے ماموں سے ہنسلی کڑے گھڑاؤ رے
جائے کہو لڑکے کی خالہ سے کرتے ٹوپی لاؤ رے
جائے کہو لڑکے کے دادا سے بھانڈ بھنڈیلے نچاؤ رے

اس گیت میں ایک خوبی اور ہے جو عورتیں تو اچھی طرح سمجھتی ہیں لیکن عموماً مرد نظر انداز کر جاتے ہیں وہ یہ کہ ماں اپنے اور بچہ کے نقطۂ نظر سے سب سے زیادہ جاننے والے شخص یعنی باپ کو پہلے خبر کرتی ہے اور اس کے سپرد کام بھی ایسا کیا ہے جو اسکے لئے بہت موزوں ہے یعنی نوبت کے ذریعہ سے سب کو اطلاع دینا - اس کے بعد اسے خود اپنا باپ سب سے زیادہ چہیتا ہوتا ہے اور اسی کے یہاں سے کھچڑی کے آنے کا رواج ہے - پھر ماموں کا نام لیتی ہے جس پر اس کا زور بھی زیادہ ہے اور جس سے امیدیں بھی وابستہ ہیں ہنسلی کڑے گھڑوانا اسی کو زیب دیتا ہے اپنی بہن سے صرف کرتا ٹوپی منگواتی ہے اور سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ کہ اپنے سسر سے بھانڈ بھنڈیلے نچوانے کا تقاضا ہے -

اگر ادب کو ادب کہنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس میں قدیمی تمدن اور سماجی زندگی کی جھلک پائی جائے تو اس گیت کو ادب نہ کہنا سراسر ظلم ہوگا -

۴- زچہ خانے کا ایک اور گیت ہے - اچھوانی - گوند کھانے اور حریرے زچہ کی غذائیں ہیں، لیکن زچہ کے بہانے سبھی

گیت نمبر ۱ - ۲ - ۳ - ۴ - اقبال دلہن مصنفہ بشیر الدین خلف نذیر احمد صاحب سے ماخوذ ہیں -

کھاتے ہیں اور اس کے لئے خوب ہی چھینا جھپٹی ہوتی ہے۔ گیت میں اس کا نقشہ دیکھئے:-

بڑی ہشیار - آج میری جچا (زچہ) بڑی ہشیار - آج بہو بیگم بڑی ہشیار

ذرا سا حریرہ نندیں مانگیں لے کر دوڑیں چمچہ

چمچہ سے مارا بس کر - کڑھیا ماری بس کر کہ چھکنی ماری بس کر کہ چمٹا مارا بس کر کہ لکڑی ماری بس کر - بڑی ہشیار.....

ذرا سا حریرہ خلائیں مانگیں، لے کر دوڑیں چمچہ

چمچہ سے مارا بس کر، دولیری ماری بس کر کہ ڈھیا ماری بس کر پنیری ماری بس کر - بڑی ہشیار .....

ذرا سا حریرہ جٹھانی مانگیں کر لے کے دوڑیں چمچہ

چمچہ سے مارا بس کر - کڑھیا ماری بس کر - کہ بانس مارا بس کر - کہ بلّی ماری بس کر - بڑی ہشیار .....

۵ - یہ گیت دادی کی طرف سے ہے جس میں وہ نیگ دینے کے لئے فراخدلی سے تیار ہے۔ نیگ کے جھگڑا کرنا بظاہر بہت چھوٹی بات معلوم ہوتی ہے لیکن یہی چھوٹی چھوٹی باتیں پچھلے زمانہ میں اور اب بھی محبت کی وہ زنجیریں تھیں جن سے افراد خاندان کو جکڑے رہتے تھے۔

مورا دلروا کے آج بھئے للنا (لال)

سجھ گھڑی سلمتی (سلامتی) سے آئے پھر بھئے گھر اور انگنا

بھیتر نندی جھگڑا مچاویں باہر کھڑے ان کے سجنا

نندی کو جوڑا نند دیا کو گھوڑا، نیگ دیدوں جیا بھرنا

مورے دلروا کے آج بھئے

لوریاں - اُردو شاعری نے خمریات و عشقیات و تصوف کے علاوہ اور ہر موضوع کا دروازہ اپنے اوپر بند کر لیا - لیکن دوسری زبانیں قابل رشک ہیں کہ انھوں نے اپنی شاعری کے دامن میں چن چن کر وہ سب موتی بھر لئے جو آج انکو ہماری زبان پر فوقیت لیجانے کا دعویدار بناتی ہیں۔ ان اصناف شاعری میں لوریاں اور بچہ کھلانے کے گیت بھی شامل ہیں ممکن ہے کہ بعض نگاہیں ان موتیوں کو سنگ ریزے سمجھ کر انھیں قابل اعتنا نہ قرار دیں، لیکن بلنزاک کا یہ خیال کہ "دنیا کا سب سے میٹھا گیت وہ لوری ہے جسے ہم صبح زندگی میں ماں کے منہ سے سنتے ہیں" آب زر سے لکھنے کے قابل ہے - کیونکہ یہ پہلا سبق ہے جس سے مائیں اپنے بچوں کو موزونیت اور موسیقیت سے روشناس کراتی ہیں - ادبی حیثیت سے یہ لوریاں ماؤں، دادیوں اور نانیوں کی ان تمناؤں اور آرزوؤں کا عکس ہیں جو بچوں سے وابستہ ہوتی ہیں۔

یہ گیت حیات اللہ صاحب انصاری کے مضمون بٹیٹھ اُردو، (اُردو اکتوبر ۱۹۴۱ء) سے لیا گیا ہے۔

۱- لڑکے کی لوری :- ہوں ہوں ہوں

بھیّا جیوے ہوں ہوں ہوں

ساواں کو دوں دل مل جائے

کوئی کا بھات سائیں لے جائے

بیری دیکھے جل مرجائے ہوں ہوں ہوں

۲- لڑکی کی لوری :- ہوں ہوں ہوں

ہوں ہوں ہوں ہوں

بی بی بٹیا نیکاناؤں بابا سنہیں دیہیں گانوئی

(اچھا نام) (لیں گے دیں گے)

بابا دے چاچا بہلائے چھٹکا برنا لہریں لائے

(چھوٹا بھائی)

۳- جھولے کی لوری :- جھکوں جھکولے جھولے مورا للوا

کاہے کی ڈوری کاہے کا جھلوا (جھولا)

کاہے کے جھکولے جھولے مورا للوا - جھکوں جھکولے ....

سونے کا جھلوا ریشم کی ڈوری

سکھ کے جھکولے جھولے مورا للوا جھکوں جھکولے ....

۴- پالنے کی لوری :- میں پالنا جھلاؤں لال کا

جب مورا لال گھٹنوں سرکے

صندل سے اگنا لپاؤں

جب مورا لال مما مانگے

کوؤں ماں کھانڈ جھکاؤں (ڈلواؤں)

جب مورا لال ہپّا ماں گے

بھوکے برہمن کھلاؤں - میں پالنا رے جھلاؤں

۵- جھولا جھلاتے وقت :-

آرام کا ہے پالنا اور سکھ کی ہے ڈور اللہ نبی جی مدد کریں تو طالع تیرے زور

ان لوریوں میں ماں کی تمنا اور آرزو کبھی اپنی بچّی کو جہیز میں گاؤں دلواتی ہے کبھی سونے کا پالنا اور ریشم کی ڈوری کی خواب

لوری نمبر ۱ - ۲ - ۳ - ۴ 'بھٹیالی اردو' سے لی گئی ہیں -

دیکھتی ہے کہیں صندل سے اپنا صحن لیپتی ہے کنوؤں میں کھانڈ ڈلواتی ہے اور برہمن کھلاتی ہے - خیال رہے کہ امراء میں یہ تمنائیں واقعہ کی شکل اختیار کرلیتی تھیں اور غربا میں یہ سنہرے خواب کی 'محلوں کے خواب' کا الزام ان ان پر عاید نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر یہ خواب خود اپنے لئے ہوتا تو مضحکہ خیز ہوتا - لیکن کونسی ماں ہے جو اپنے بچوں کے لئے بڑی سے بڑی نعمت کی خواہاں نہ ہو - زندگی میں انسان خود جس چیز کو حاصل نہ کر سکے وہ بچوں کے حق میں تمنا اور آرزو سیدھی سادی شکل اختیار کرلیتی ہے - ذیل کا گیت اس سادگی کی مثال ہے :-

۶- تو سوتا سوتا جاگ — تیرے ماتھیں لاگے بھاگ
تو سوجا میرے لال — تیری اماں ہو نہال
تو سوجا میرے چندا — تجھے کیا کرتا ہے دھندا
تو سوجا میرے پھول — اور سکھ سے پالنا جھول
تو سوجا میرے جانی — تری بھاگ بھری پیشانی

ماں بچے کو پیار کر کے جو خوشی محسوس کرتی ہے اس کا اندازہ صرف ماں ہی کو ہو سکتا ہے مامتا کے جذبات کا الفاظ میں اظہار ناممکن ہے لیکن جس حد تک الفاظ اس لذت کے اظہار پر قدرت رکھتے ہیں وہ اس گیت میں نمایاں ہے :-

۷- چوموں تیرے نین میرے دل کو آئے چین
چوموں تیرا مکھڑا بھولوں سارا دکھڑا
چوموں تیرے گال تو دل ہو مالا مال
چوموں تیرا سینہ تو دل کا ہے نگینہ

۸ - ایک لوری جو آج تک ماؤں کی زبان پر جاری ہے اور نہ معلوم کب سے بچوں کو سلاتی چلی آرہی ہے یہ ہے :-

آجا ری نندیا تو آ کیوں نہ جا — میرے بچے کی آنکھوں میں گھل مل جا
آتی ہوں بیوی میں آتی ہوں — دو چار بچے سلاتی ہوں
دو چار بالے بچے تو پیچھے سلا — پہلے میرے بچے کی آنکھوں میں گھل مل جا
آجا ری نندیا تو آ کیوں نہ جا — - - - - - - - - - - -

ماں بچے کو سلا رہی ہے نیند سے پہلے بچے ایک خاص بے چینی سی محسوس کرتے ہیں انھیں اس بے چینی پر قابو پانے کے لئے ماں اسے بہلاتی ہے کہ میں نیند کو بلاتی ہوں وہ آجائے گی تو تم آرام سے سو جاؤ گے - آ کیوں نہ جا، میں جو تاکید اور

لوری نمبر ۵ - ۶ - ۷ - اقبال 'دلہن' سے لی گئی ہیں -

اصرار پنہاں ہے اور گھل مل جانے میں جو نیند کی مادی تحلیل کی گئی ہے اس کا اظہار شاعری کے اور کسی پیرائے سے ممکن نہ تھا بچہ ابھی سویا نہیں اور اس دھوکے کو قایم رکھنے کے لئے یہ ضروری ہو گیا کہ کوئی اور بہانہ تلاش کیا جائے۔ ماں آواز کو ذرا دھیمی اور باریک بنا کر خود نیند کی طرف سے جواب دیتی ہے' بیوی میں آتی ہوں ذرا دو چار بچوں کو سلالوں' بچہ اب بھی نہیں سویا اور ماں کی تاکید نے اب خود غرضی کی شکل اختیار کر لی۔ اسے دوسروں کے بچوں سے کچھ غرض نہیں وہ تو یہ چاہتی ہے کہ پہلے اس کے بچے کے آرام کا انتظام کیا جائے۔

بچوں کو کھلاتے وقت ایک اور گیت گایا جاتا ہے۔ یہ زبان زد عام ہے:-

۹- چندا ماموں دور کے — بڑے پکائیں بور کے
آپ کھائیں تھالی میں — ہمیں دیں پیالی میں
پیالی گئی ٹوٹ — چندا ماموں گئے روٹھ
پیالی آئی اور ، — چندا ماموں آئے دوڑ
جگ جگ جگ جگ جیا کرو — دودھ بتاشے پیا کرو

اس گیت میں بے ساختگی قابلِ غور ہے۔ چاند ایک حسین اور دلکش شے ہے اس لئے اسے 'ماموں' کا لقب دیکر ماں اپنے بھائی کی محبت کی غمازی کرتی ہے اور اپنے بچے کے دل میں ماموں کو تمام رشتہ داروں پر تفوق دینے کا پروپیگنڈا کر رہی ہے۔ چاند کے فاصلہ نے دور کا لفظ منہ سے نکلوایا۔ دور کے لئے بور کا قافیہ بے ساختہ پیدا ہو گیا۔ بڑے کھانے کی چیز ہیں اس لئے کھانے کا برتن تھالی گیت کے مصنف کے ذہن میں آیا اور چاند کو تھالی سے تشبیہ دی۔ قافیے خود بخود سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔ چندا ماموں کے روٹھنے پر ایک اور پیالی کا منگایا جانا ضروری ہو گیا اور چندا ماموں کا روٹھنا رانی کیکئی کا سا روٹھنا تو تھا ہی نہیں بچوں کے چندا ماموں خود بچے ہیں دوڑے ہوئے چلے آئے۔ چندا ماموں کا روٹھ جانا اور دوڑے ہوئے آنا چندا ماموں کی حرکات کا کتنا مکمل اور سادہ نقشہ ہے۔

بسم اللہ بیگم

تذکرۂ معرکۂ سخن

(اب کسی قیمت پر نہیں مل سکتا)

لیکن اتفاق سے اس کی چند جلدیں اسٹاک میں مل گئی ہیں۔ اس لئے جن حضرات کو ضرورت ہو فوراً اطلاع دیں۔

قیمت علاوہ محصول ڈاک چار روپیہ

مینجر نگار لکھنؤ

تعلیم اور تربیت

ہر سنجیدہ علمی نظریہ کے دو اجزا ہونے چاہئیے - زندگی کے مقاصد کا تصور اور نفسیاتی محرکات یعنی دماغی تبدیلیوں کے اصول کا علم - وہ لوگ جو زندگی کے مقاصد کے متعلق مختلف الرائے ہوں، تعلیم کے معاملہ میں کبھی متفق نہیں ہو سکتے۔ تمام مغربی تہذیب میں، تعلیمی مشین در اخلاقی نظریوں کے تحت چلتی ہے، عیسائیت اور قومیت - اور اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ دونوں کبھی ہم آہنگ نہیں ہو سکتے - میرے نزدیک جہاں ان دونوں میں اختلاف ہو، میں عیسائیت کو ترجیح دیتا ہوں اور جہاں دونوں متفق ہوں، دونوں کو غلط تصور کرتا ہوں - تعلیم کی غرض و غایت میرے نزدیک تہذیب ہے اور اس اصطلاح کی تعریف میرے خیال میں جزوی طور پر انفرادی اور جزوی طور پر اجتماعی ہے - جہاں تک فرد کا تعلق ہے یہ اخلاقی اور عقلی دونوں صفات پر مشتمل ہے - عقلی صفات سے مراد ہے عام معلومات کی ایک مخصوص مقدار، اپنے پیشہ میں فنی دستگاہ اور مشاہدہ کر کے رائے قائم کرنے کی عادت - اور اخلاقی صفات غیر جانبداری، رحم دلی اور ضبط نفس کی قلیل مقدار پر مشتمل ہوتی ہیں - مجھے اس میں ایک اور صفت کا اضافہ کرنا چاہئیے جو نہ تو اخلاقی ہے اور نہ عقلی بلکہ عضویاتی ہے یعنی زندگی کے لئے مسرت اور امنگ محسوس کرنا - اجتماعی طور پر تہذیب، قانون کا احترام کرنے، آدمی آدمی کے درمیان انصاف کرنے اور ایسے مقاصد اختیار نہ کرنے جن سے انسانی نسل کے کسی طبقہ کو دائمی نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو اور اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جائز ذرایع ڈھونڈھنے کا مطالبہ کرتی ہے -

اگر ہم انھیں کو تعلیم کے اغراض و مقاصد میں شمار کر لیں تو نفسیاتی سائنس کے نزدیک یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انکے حصول کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں اور خصوصاً کسی قدر آزادی اس کے لئے سب سے زیادہ مفید ثابت ہوگی -

زمانۂ حاضرہ میں تعلیم میں آزادی کے سوال کے متعلق تین خیال پائے جاتے ہیں، بعض کا کہنا ہے کہ بچوں کو مکمل آزادی ملنی چاہئے چاہے وہ کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں - بعض انھیں آزاد تو رکھنا چاہتے ہیں، لیکن انکی آزادی کے باوجود بھی وہ انھیں اچھا دیکھنے کے خواہشمند ہیں - یہ آخری جماعت اپنے منطقی استحقاق کے مقابلہ میں زیادہ بڑی ہے - بچوں کو اگر بالغوں کی طرح آزاد چھوڑ دیا جائے تو ان میں اوصاف حمیدہ کا پیدا ہونا مشتبہ ہو جاتا ہے یہ عقیدہ کہ آزادی یقیناً اخلاقی عروج پیدا کرے گی روسو کی باقیات سے تعلق رکھتا ہے اور بچوں اور جانوروں کا مطالعہ کرنے کے بعد باقی نہیں رہ سکتا - اس عقیدہ کے رکھنے والے یہ خیال کرتے ہیں کہ تعلیم کا کوئی ایجابی مقصد نہیں ہونا چاہئے

بلکہ اسے بچوں کی آزاد نشوونما کے لئے ایک مناسب ماحول مہیا کرنا چاہئے۔ میں اس مکتب سے اتفاق نہیں کر سکتا کیونکہ یہ مجھے بہت زیادہ انفرادی اور علم کی اہمیت کو نظر انداز کرنے والا معلوم ہوتا ہے، ہم ایسے طبقات میں رہتے ہیں جن میں باہمی تعاون کی ضرورت ہے اور آزادانہ نشوونما سے اس تعاون کی توقع کرنا شیخ چلی پن کا مظاہرہ کرنا ہے۔ محدود رقبہ میں ایک بڑی آبادی صرف سائنس اور صنعت گری ہی کے بل بوتے پر قایم رہ سکتی ہے اور تعلیم کو ہمیں ان کی کم سے کم مقدار تو فراہم کرنی ہی چاہئے۔ وہ معلمین جو بہت زیادہ آزادی دینے کے حق میں ہیں ان کی کامیابی کرداری نفسی، ضبط نفس اور تربیت یافتہ عقل پر منحصر ہے اور ان صفات کا پیدا ہونا ناممکن ہے اگر ہر محرک کو آزاد چھوڑ دیا جائے۔ ان کی خوبیوں کو قایم رکھنے کے لئے ان کے طریقوں میں ترمیم کرنا ناگزیر ہے۔ اجتماعی نقطۂ نظر سے دیکھئے تو تعلیم محض بالیدگی کا موقع فراہم کرنے کی بہ نسبت زیادہ ایجابی معلوم ہوتی ہے۔ اسے موقع تو فراہم کرنا ہی چاہئے لیکن اس کے علاوہ اسے دماغی اور اخلاقی اوصاف بھی پیدا کرنا چاہئے اور بچوں میں یہ صفات خود بخود، بغیر کسی کی امداد کے پیدا نہیں ہو سکتیں۔

تعلیم میں زیادہ آزادی دینے کے حق میں جو دلایل پیش کئے جاتے ہیں وہ انسان کی فطری شرافت سے اخذ کئے گئے ہیں، بلکہ کامل اقتدار کے اثرات پر مبنی ہیں اور اس میں صاحب اقتدار اور زیر اقتدار دونوں شامل ہیں۔ وہ جنھیں کسی اقتدار کے ماتحت رہنا پڑتا ہے یا تو کامل اطاعت گزار ہو جاتے ہیں یا پھر باغی بن جاتے ہیں اور یہ دونوں رویہ عیب سے خالی نہیں۔

اطاعت گزار خیال اور عمل دونوں کی جدت کو کھو بیٹھتے ہیں۔ علاوہ ازیں، مزاحمت کے احساس سے جو غصہ پیدا ہوتا ہے وہ اپنے سے کمزور لوگوں کو جھڑکنے کے بعد ہی فرو ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ظالمانہ قوانین اپنی بقا کا سامان اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ایک انسان اپنے باپ کے ہاتھوں جو اذیتیں سہتا ہے، وہی اذیتیں وہ اپنے بیٹے کو دیتا ہے اور جو ذلتیں اسے اپنے اسکول کے زمانہ کی یاد رہ جاتی ہیں، بالغ سلطنت بننے پر وہی ذلتیں وہ اپنی رعایا کو پہونچاتا ہے۔ اسی طرح غیر واجب اقتدار پسند تعلیم، اپنے متعلمین کو بزدل بنا دیتی ہے جو گفتار و کردار میں کوئی نئی روش نکال سکتے ہیں اور نہ کسی ایسی روش کو برداشت کر سکتے ہیں۔ معلمین پر اس سے بھی برا اثر مرتب ہوتا ہے، ان میں سادیت[1] پسند باضابطگی پیدا ہو جاتی ہے۔ خوفزدہ کرنے سے انھیں مسرت حاصل ہوتی ہے لیکن سوائے خوفزدہ کرنے کے ان کو اور کچھ نہیں آتا۔ اور چونکہ یہ حضرات علم کی نمایندگی کرتے ہیں اس لئے متعلمین خود علم ہی سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ اس خوف کو انگریزوں کے اعلیٰ طبقوں میں انسانی فطرت کا ایک جزو سمجھا جاتا ہے لیکن در اصل یہ اقتدار پسند ملاؤں کی گہری نفرت کا ایک حصہ ہوتا ہے۔

اس کے برعکس، بغاوت خواہ کیسی ہی ضروری کیوں نہ ہو، موجودہ حالت کی طرف اس کا رجحان صحتمندانہ نہیں ہوتا۔

---

[1] sadistic :- دوسروں کو ذہنی یا جسمانی تکلیف پہونچانے میں جنسی لذت محسوس کرنا۔

علاوہ ازیں بغاوت کرنے کے بھی متعدد طریقے ہوتے ہیں اور ان طریقوں کی بہت قلیل تعداد معقولیت پر مبنی ہوتی ہے۔ گلیلو ایک باغی تھا اور وہ عقلمند تھا۔ زمین کو چپٹی سمجھنے والے بھی باغی ہیں اور وہ بیوقوف ہیں ہر وہ رجحان خطرہ سے خالی نہیں ہوتا جس کے بموجب اقتدار سے انحراف لازمی طور پر قابل توصیف ہوتا ہے اور غیر رسمی رائیں قطعی طور پر صحیح ہوتی ہیں۔ روشنی کے کھمبوں کو اکھاڑنے یا شیکسپیر کو شاعر نہ تسلیم کرنے سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن اقتدار کی زیادتی اکثر ذہین طلباء میں اس شدید قسم کی بغاوت پر منتج ہوتی ہے۔ اور جب یہی باغی معلم بن جاتے ہیں اور وہ کبھی کبھی اپنے طلباء کی سرکشی کی ہمت افزائی کرتے ہیں اور بیک وقت ان کے لئے سازگار ماحول بھی پیدا کرنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں مقاصد شاذ ہی ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو سکتے ہیں۔

اس لئے ضرورت اطاعت یا بغاوت کی نہیں، بلکہ اچھی فطرت، نئے خیالات اور لوگوں سے ہمدردی کی ہے ان اوصاف کا کچھ تو انحصار طبیعیاتی اسباب پر ہے جن کی طرف پرانے خیال کے معلمین نے بہت کم توجہ دی ہے اور زیادہ تر اس شکست خوردہ ذہنیت کے احساس سے محفوظ رکھنے پر ہے جو قومی محرکات میں مداخلت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ چھوٹے بچوں کو ہمدرد بالغان میں تبدیل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اکثر حالتوں میں وہ اپنے ماحول کو اپنے لئے سازگار محسوس کریں اس کے لئے لازمی ہے کہ بچے کی اہم خواہشات کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا جائے۔ اس پر کسی خاص مقصد مثلاً جلوۂ حق یا وطن کی عظمت کو اختیار کرنے پر زور نہ ڈالا جائے اور پڑھاتے وقت اسے یہ ذہن نشین کرانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے کہ جو کچھ اسے پڑھایا جا رہا ہے اس کے لئے بڑے کام کی چیز ہے، جب بچہ اپنی مرضی سے تعاون کرتا ہے تو وہ دوگنی ترقی کرتا ہے اور آدھی تھکان محسوس کرتا ہے۔ بچے کی بڑھی ہوئی آزادی کے حق میں یہ بڑے قوی دلایل ہیں۔ ان مباحث کو آسانی سے اور بھی زیادہ طول دیا جا سکتا ہے۔ بچہ کو ایک غلام کے معائب سے مبرّا رکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس میں ایک اشراف Aristocrat کے عیوب پیدا ہو جائیں۔ بڑے معاملات ہی میں نہیں، بلکہ روزمرہ کی معمولی باتوں میں بھی، دوسروں کا لحاظ رکھنا تہذیب کا ایک ضروری عنصر ہے جس کے بغیر اجتماعی زندگی ناقابل برداشت ہو جائے گی۔ یہاں میرے پیشِ نظر خوش اخلاقی کی مختلف شکلیں مثلاً "شکریہ ادا کرنا" یا "از راہ کرم" کہنا نہیں ہیں۔ عوائد رسمیہ غیر مہذب لوگوں میں بڑی حد تک ترقی کر جاتے ہیں اور تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ گھٹتے جاتے ہیں۔ اس وقت میرے ذہن میں وہ رضاکارانہ اسپرٹ ہے جو ضروری کاموں میں اپنا ہاتھ بٹاتی ہے اور ممنونیت کے ساتھ باہمی تکالیف کو رفع کرنے میں کوشاں رہتی ہے۔ سلیم العقل ہونا ہی خوش اخلاقی کی ایک شکل ہے اور بچے میں قدرت کاملہ کا احساس پیدا کر دینا یا یہ عقیدہ راسخ کر دینا اچھا نہیں کہ بالغان صرف بچوں کی مسرت کو ختم کرنے کے لئے ہی زندہ رہتے ہیں وہ لوگ جو کاہل امرا کے وجود سے نفرت کرتے ہیں، اپنی وضعداری کو صرف اسی صورت میں نبھا سکتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں میں کام کے ضروری ہونے کا احساس اور لگاتار محنت کرنے کی عادت پیدا کر دیں۔

اس کے علاوہ آزادی کے حامی ایک اور امر پر زیادہ توجہ نہیں دیتے - بچوں کی اس جماعت میں جس میں بالغان کا کوئی دخل نہیں ہوتا، قوی بچے زیادتی کرنے لگتے ہیں اور کبھی کبھی ان کے مظالم بالغان کے ظلم سے کہیں زیادہ بہیمانہ ہو جاتے ہیں - اگر دو تین سال کے دو بچے ساتھ ساتھ کھیلنے کے لئے چھوڑ دئے جائیں تو وہ ایک دو بار لڑنے بھڑنے کے بعد یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ ان میں کون زیادہ قوی ہے اور اس انکشاف کے ساتھ ہی کمزور بچہ قوی بچہ کا غلام بن جاتا ہے جہاں بچوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے وہاں دو تین بچے مکمل اقتدار حاصل کر لیتے ہیں اور دوسرے بچوں کو اس جماعت کے مقابلہ میں کم آزادی میسر آتی ہے جہاں بالغان دخل اندازی کر کے کمزور اور کم مفسد بچوں کو محفوظ رکھتے ہیں، بچوں میں دوسروں کا لحاظ کرنے کی عادت خود بخود پیدا نہیں ہوتی بلکہ پیدا کی جاتی ہے اور بغیر کسی اُستاد کی رہنمائی کے اس کا پیدا ہونا ناممکن ہے - بالغان کی بچوں سے علیحدگی کے خلاف غالباً یہ سب سے زیادہ قوی دلیل ہے -

میرے خیال میں ماہرین تعلیم نے ابھی تک ضروری اخلاقی تربیت کے ساتھ آزادی کی مستحسن شکلوں کے صحیح تناسب کے مسئلہ کو حل نہیں کیا ہے - یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کا صحیح حل بچوں کے اسکول میں داخلہ سے پہلے ہی ان کے والدین ناممکن بنا دیتے ہیں - جس طرح محلل نفسیات اپنے طبی تجربہ کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ہم سب پاگل ہیں، اسی طرح موجودہ اسکولوں کے اساتذہ ان بچوں کی بنا پر جنھیں ان کے والدین نے ناقابل تربیت بنا دیا ہے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ تمام بچے ایک مشکل معمہ اور ان کے والدین قطعی بیوقوف ہوتے ہیں - جو بچے والدین کے ظلم کے باعث وحشی ہو جاتے ہیں (اور یہ ظلم اکثر والہانہ محبت کی شکل اختیار کر لیتا ہے) انھیں ایک طویل یا مختصر عرصہ کے لئے بالکل آزاد فضا میں چھوڑ دینا چاہئے تاکہ بالغوں کے متعلق ان کے شبہات دور ہو سکیں - لیکن وہ بچے جن کی پرورش گھر پر سمجھداری سے کیجاتی ہے - جب وہ معمولی راستوں کو اختیار کر لیں تو آسانی سے ان کی مزاحمت کی جا سکتی ہے اور ان کو ان راہوں پر لگایا جا سکتا ہے جو وہ خود اپنے لئے اہم گردانتے ہیں - وہ بالغان جو بچوں کو پسند کرتے ہیں اور ان کی صحبت سے ان پر اعصابی تھکن نہیں پیدا ہوتی وہ بچوں کی بڑی آسانی سے تربیت کر سکتے ہیں اور ان کے طلبا ان کے متعلق دوستانہ احساسات رکھیں گے -

میرا خیال ہے کہ موجودہ تعلیمی نظریہ ساز بچوں کے ساتھ مداخلت نہ کرنے کی منفی صفت پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے ہیں اور اس کے برخلاف وہ بچوں کی صحبت سے لطف اندوز ہونے کے ایجابی وصف پر کم توجہ دیتے ہیں - اگر بچوں سے تمھاری محبت اس قسم کی ہے جیسی بعض انسانوں کو کتوں یا گھوڑوں سے ہوتی ہے تو وہ ہمیشہ تمھارے اشاروں پر عمل کرنے اور تمھارے امتناعی احکام کو ماننے کے عادی ہو جائیں گے اور تمھارے احکام کی تعمیل کرنے میں ممکن ہے بعض دفعہ وہ بڑبڑانے لگیں لیکن تمھارے خلاف برہمی کے جذبات ان میں پیدا نہیں ہوں گے - تمھاری اس قسم کی پسند جو انھیں اجتماعی جدوجہد کا میدان معلوم ہو، ان کے لئے ہرگز سودمند نہیں ہو سکتی - اگر آپ کسی بچے سے

ہمدردی رکھتے ہیں اور اس ہمدردی کا نشانہ اس سے اپنی جماعت کے لئے ووٹ حاصل کرنا یا اسے بادشاہ اور ملک پر قربان کرنا ہے تو وہ آپ کی ہمدردی کا شکر گزار نہیں ہوگا - صرف وہی دلچسپی مستحسن کہی جا سکتی ہے جو بچوں کی آزادانہ مسرت کو ملحوظ رکھے اور جس کے سامنے در پردہ کوئی اور مقصد نہ ہو - وہ مدرسین جن میں یہ خوبی ہے انھیں بچوں کی آزادی میں شاذ و نادر ہی مداخلت کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے اور بوقت ضرورت وہ بچوں کو نفسیاتی نقصان پہونچائے بغیر ایسا کر سکتے ہیں -

بدقسمتی سے ہمارے معلمین جن پر کام کا بار بہت زیادہ رہتا ہے ان میں بچوں سے وجدانی محبت کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی - انھیں لازمی طور پر ان کے متعلق وہی احساس ہونے لگتا ہے جو روایتی حلوائی کا امیدوار بادامی بسکٹ کے متعلق رکھتا ہے - میرے خیال میں تعلیم کسی شخص کا واحد پیشہ نہیں ہونا چاہئے اور یہ کام ہر روز دو گھنٹے ان لوگوں کو انجام دینا چاہئے جو اپنا بقیہ وقت بچوں سے الگ رہ کر گزارتے ہوں - بچوں کا معاشرہ تھکاوٹ پیدا کر دیتا ہے اور خاص طور سے جبکہ انھیں اچھی تربیت نہ ملی ہو - تھکاوٹ آخر کار غصہ پر منتج ہوتی ہے اور معلم خواہ کسی نظریہ پر یقین رکھتا ہو، یہ غصہ کسی نہ کسی شکل میں ظاہر ہی ہو کر رہتا ہے - ہمدردی صرف ضبط نفس کی بنا پر قایم نہیں رکھی جا سکتی، لیکن جہاں کہیں یہ قایم رہتی ہے وہاں پہلے ہی سے کچھ ایسے اصولوں کا پیش کرنا غیر ضروری ہوتا ہے جن کے ذریعہ شریر بچوں کی اصلاح کی جا سکے کیونکہ محرک ہی کسی صحیح فیصلہ پر پہونچا سکتا ہے اور ہر وہ فیصلہ صحیح ہوگا جو بچے میں یہ احساس پیدا کر دے کہ تم اسے پسند کرتے ہو - اصول کتنا ہی معقول کیوں نہ ہو، سلیقہ اور محبت کا نعم البدل نہیں ہو سکتا -

(ترجمہ) محمد عظیم

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی
انجیلِ انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ - جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوعِ انسانی کو "انسانیتِ کبریٰ و اخوتِ عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقاید، رسالت کے مفہوم اور صحایفِ مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے — ضخامت ۲۷۶ صفحات - مجلد سات روپیہ آٹھ آنہ (پیشگی) علاوہ محصول - منیجر نگار

سرزمین سندھ کی ایک تاریخی کہانی

(سسّی، پنّوں)

ایشیا کے افسانہائے محبت میں، لیلیٰ و مجنوں اور وامق و عذرا کو جو حیثیت حاصل ہے وہی حیثیت پنجاب کے ہیر و رانجھا اور سندھ کے سسّی اور پنّوں کو حاصل ہے۔

ہیر و رانجھا سے ہم لوگ زیادہ واقف ہیں، لیکن سسّی، پنّوں سے کم، کیونکہ سندھ نسبتاً ہم سے زیادہ دور واقع ہے اور وہاں کی روایات سننے کا کم اتفاق ہوتا ہے، حالانکہ جس حد تک "کرشمہ ہائے محبت" کا تعلق ہے، سندھ کی سرزمین سے پیدا ہونے والے ان دو دلوں کی داستان نہایت عجیب و غریب ہے۔

ہم نے اس کو تاریخی کہانی کہا ہے۔ کہانی اس لحاظ سے کہ اس کی بعض باتیں سمجھ میں نہیں آتیں اور تاریخی اس حیثیت سے کہ مورخین سندھ نے اس کا ذکر کیا ہے اور صاحب تحفۃ الکرام نے تو خصوصیت کے ساتھ نہایت شرح و بسط کے ساتھ اسکو پیش کیا ہے، سندھ میں یہ روایت بہت مقبول ہے اور اکثر شعراء نے اس پر طبع آزمائی کی ہے، میر معصوم بھکری نے اپنی مثنوی حسن و ناز میں اس قصہ کو نظم کیا۔ اس کے بعد محمد شاہ، بادشاہ دہلی کے عہد میں قاضی مرتضیٰ سورتی نے لکھا اور لفٹنٹ برٹن اور مسز لوسٹن نے انگریزی میں اسے منتقل کیا۔ مولانا شرر مرحوم نے بھی اس کو لکھا ہے اور ہمارا ماخذ بھی یہی ہے۔

قدیم سندھ میں ایک شہر تھا جس کا نام بھام براوہ تھا اور راجہ ڈلورائے یہاں کا فرمانروا تھا۔ اسی کے زمانہ میں یہاں ایک برہمن رہتا تھا جس کا نام نانیا تھا یہ ایک متوسط الحال خاندان کا فرد تھا اور عزت و حرمت کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کی بیوی کا نام سندر تھا جس سے وہ بہت محبت کرتا تھا لیکن ان کے کوئی اولاد نہ تھی جس سے میاں بیوی دونوں بہت دلگرفتہ رہا کرتے تھے۔

اتفاق سے اخیر عمر میں ان کے لڑکی پیدا ہوئی جو غیر معمولی حسین تھی۔ اس نے شہر کے جوتشیوں کو بلا کر لڑکی کا زائچہ طیار کرایا تو سب نے حکم لگایا کہ یہ لڑکی کسی مسلمان سے بیاہی جائے گی۔ یہ خبر سنکر باپ ماں دونوں بہت فکرمند ہوئے اور آخر کار انھوں نے اس شرمناک نتیجہ کے خوف سے لڑکی کو ایک صندوق میں بند کر کے دریا میں بہا دیا۔

یہ صندوق بہتا بہتا بھمبور کے ساحل تک پہونچا - یہاں ایک بہت مشہور دھوبی رہتا تھا جس کا نام نہیا تھا اور لالہ کے لقب سے مشہور تھا - اس دھوبی کے بہت سے چیلے تھے جو دریا کے کنارے کپڑے دھویا کرتے تھے - انھیں میں سے کسی ایک کو یہ صندوق ہاتھ لگا اور وہ اس طرح بغیر کھولے لالہ دھوبی کے پاس لے گیا - اس نے جو صندوق کھولا تو وہ لڑکی کو دیکھ کر حیران رہ گیا اور چونکہ وہ لاولد تھا اس لئے بیٹی کی طرح اس کی پرورش کرنے لگا اور اسکی چاندسی صورت کی رعایت سے سسّی اس کا نام رکھا -

جب یہ لڑکی ذرا بڑی ہوئی تو اس کے حُسن کی شہرت پھیلنے لگی اور رفتہ رفتہ دور دور تک اس کا چرچا ہونے لگا، یہاں تک کہ لوگ اسے دیکھنے آتے اور اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر حیران رہ جاتے - اسی زمانہ میں چند قافلے تاجروں کے سندھ سے مکران پہونچے اور ان کے ذریعہ سے شہر تُش کے امیرزادہ پنوں تک بھی یہ خبر پہونچی - پنوں فطرتاً بڑا عاشق مزاج اور حُسن پرست تھا اس لئے سسّی کے غیر معمولی حُسن کی خبر سنکر نادیدہ عاشق ہوگیا اور سوداگر کے بھیس میں اس شہر میں پہونچا جہاں لالہ دھوبی رہتا تھا اور سسّی کو دیکھ کر دیوانہ ہوگیا - آخر کار وہ لالہ کا چیلا ہوگیا اور دوسرے چیلوں کی طرح روز گھاٹ پر جاکر کپڑے دھونے لگا - تاکہ وہ سسّی کو روز دیکھ سکے رفتہ رفتہ سسّی بھی اس کی طرف مایل ہوئی اور آخر کار اس کی محبت کا دم بھرنے لگی -

محبت کی نگاہیں چھپ نہیں سکتیں، مشہور بات ہے - اس لئے لوگوں میں رشک و حسد کے جذبات پیدا ہوئے اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کی تدبیریں سوچی جانے لگیں - اتفاق سے ایک سنارن تھی جو غالباً خود بھی پنوں سے محبت کرنے لگی تھی، اس نے پنوں سے کہا کہ تم ناحق سسّی کے لئے جان کھوتے ہو - وہ ایک اور جوان سے محبت کرتی ہے اور تمھیں دھوکا دیتی ہے، پنوں کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اور اس نے سسّی سے شکایت کی -

سسّی، اس الزام کو برداشت نہ کر سکی اور اس زمانہ کے رواج کے مطابق اپنی سچائی کے ثابت کرنے کے لئے آگ میں کود پڑی اور اس سے محفوظ نکل آئی - پنوں پر اس کا بڑا اثر ہوا اور آخر کار ان دونوں کی شادی ہوگئی -

جب یہ خبر پنوں کے باپ کو پہونچی جو کش کا فرمانروا تھا، تو اسے بہت غصہ آیا اور اس نے چند آدمی روانہ کئے کہ جس طرح ممکن ہو پنوں کو واپس لے آئیں - یہ لوگ گئے اور خود پنوں کے مہمان، رات کو جب سسّی اور پنوں سو گئے تو انھوں نے پنوں کو زبردستی پکڑ کر اونٹ کی پیٹھ پر رسیوں سے کس دیا اور مکران لے گئے -

صبح کو سسّی اُٹھی اور پنوں کو نہ دیکھا تو رونے پیٹنے لگی اور کپڑے پھاڑ ڈالے کہا جاتا ہے کہ سسّی کو ان واقعات کا علم ایک خواب کے ذریعہ سے اسی رات ہوگیا تھا جب وہ بیاہی گئی تھی - وہاں رسم تھی کہ دُلھنیں شب زفاف میں مہندی کی ٹہنی ہاتھ میں لیکر سویا کرتی تھیں، چنانچہ سسّی کے پاس بھی یہ ٹہنی موجود تھی جس کو اس نے بہت حفاظت سے رکھ لیا تھا - یہ اس ٹہنی کو ہاتھ میں لیکر دیوانہ وار اپنے شوہر کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی - چالیس کوس تک اسی طرح بے آب و دانہ

چلنے کے بعد تھک کر گر پڑی اور سندھ کے ریگستان میں پیاس کی شدت سے ایڑیاں رگڑنے لگی۔ کہا جاتا ہے کہ قدرت کو اسکی حالت دیکھ کر رحم آیا اور اس نے پانی کا ایک چشمہ پیدا کر دیا جس کا پانی پیکر سسّی کی جان میں جان آئی اور مہندی کی شاخ جو اپنے ساتھ لے گئی تھی اسی چشمہ کے کنارے گاڑ دی۔ کہتے ہیں کہ وہ چشمہ آج تک موجود ہے جو کبھی خشک نہیں ہوتا اور مہندی کی ٹہنی نے ایک جھاڑی کی شکل اختیار کر لی جو اس کے چشمہ کے کنارے اب تک دیکھی جاتی ہے۔

یہاں سے سسّی جب اور آگے بڑھی تو چھ سات کوس چلنے کے بعد پھر اسے پیاس معلوم ہوئی اور تھک کر بیٹھ گئی اتفاق سے ایک گڈریا اپنی بکریاں چراتے چراتے آپہونچا اور سسّی کی خوبصورتی کو دیکھ کر اسکے دل میں بدی پیدا ہوئی اور زبردستی اس کو اپنے گھر لے جانے لگا۔ سسّی نے بہت منت و سماجت کی لیکن جب اس نے کچھ نہ سنا تو سسّی نے کہا کہ اچھا اگر تم مجبور ہی کرتے ہو تو میں تمہارے ساتھ چلوں گی، لیکن پہلے میری پیاس تو دور کرو، میرا دم نکلا جا رہا ہے گڈریا دوڑا دوڑا گیا تاکہ بکری کا دودھ لاکر اس کی پیاس بجھائے۔ اس دوران میں سسّی خدا سے اپنی عزت و آبرو بچانے کی دعا کرنے لگی دفعتاً پتھر کی چٹان جس پر وہ بیٹھی ہوئی تھی شق ہوئی اور سسّی اس میں سما گئی لیکن اسکی ساری کا آنچل باہر نکلا رہ گیا۔ جب گڈریا واپس آیا اور اس نے یہ حال دیکھا تو وہ اپنی حرکت پر بہت نادم ہوا اور اس نے وہاں سسّی کا مقبرہ بنوا دیا۔

جب پنوں پابہ زنجیر گھر پہونچا تو اس کے باپ کو اس کی حالت دیکھ کر بڑی فکر پیدا ہوئی اور ڈرا کہ کہیں مر نہ جائے۔ اس نے پنوں کے بھائیوں کو بلا کر کہا کہ پنوں کو ساتھ لیجاؤ اور اس کی بیوی کو تلاش کرو۔ جب یہ قافلہ سندھ کی طرف روانہ ہوا اور اس مقام پر اترا جہاں سسّی زندہ دفن ہو گئی تھی تو پنوں کے قدم آگے نہ اٹھے اور اسے بوئے دوست آنے لگی، اتفاق سے وہی گڈریا مل گیا جس نے سسّی کا مقبرہ بنوایا تھا اور اس نے سارا قصہ سنایا۔

پنوں نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ تم ٹھہرو میں اس کی قبر پر ہو آؤں۔ مقبرہ میں پہونچ کر یہ سسّی کی قبر سے لپٹ کر زار زار رونے لگا اور دعا مانگی کہ خدایا مجھے بھی سسّی کے پاس پہونچا دے۔ دفعتاً قبر شق ہوئی اور پنوں بھی اس میں سما گیا۔

سرزمین سندھ میں یہ روایت حسن و عشق بہت مشہور ہے اور لوگ بہ کثرت اس مقبرہ کی زیارت کے لئے جایا کرتے تھے۔ یہ مقبرہ ایسی جگہ بنا ہے جہاں منزلوں تک آبادی نہیں ہے اور کوئی ادھر سے نہیں گزرتا، لیکن مشہور ہے کہ اگر کوئی بھولا بھٹکا آپہونچتا ہے تو سسّی اور پنوں اس کی مدد کرتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح کھانا پانی اس تک پہونچا دیتے ہیں۔ چنانچہ مشہور ہے کہ ملتان کے ایک درویش جن کا نام اسماعیل تھا ایک بار اس مقبرہ کی زیارت کو گئے اور دو دن تک فاقہ کرتے رہے تیسرے دن ایک بڑھیا تھوڑی سی روٹی اور کچھ پانی لیکر آئی۔ انھوں نے کھانے سے انکار کیا اور کہا جب تک سسّی اور پنوں کی صورت نہ دیکھ لوں گا، کھانا نہ کھاؤں گا۔ یہ سنکر بڑھیا بولی کہ "لو دیکھو میں ہی سسّی

ہوں، لیکن پنوں کو دیکھنے کی خواہش نہ کرنا کیونکہ میں اس معاملہ میں ایک بار بہت دھوکا کھا چکی ہوں اور پنوں سے کسی کو نہ ملنے دوں گی۔"

درویش نے کہا مجھے کیونکر یقین آسکتا ہے کہ "تمھیں سسّی ہو، کیونکہ وہ تو بہت خوبصورت تھی، جوان تھی اور تم بڑھیا بھی ہو اور بدصورت بھی" اتنا کہہ کے جو درویش نے سر اُٹھایا تو بڑھیا کی جگہ اسے ایک نہایت حسین و جمیل صورت نظر آئی اور بولی کہ "مجھے دیکھ لیا اب تو کھانا کھاؤ" درویش بولا کہ "میں نے عہد کر لیا ہے کہ جب تک تم دونوں کو نہ دیکھ لوں گا، کھانا نہ کھاؤں گا، اس لئے پنوں کو بھی دکھا دو"۔

یہ سُنکر پہلے تو سسّی انکار کرتی رہی۔ لیکن جب درویش کا اصرار بڑھا تو وہ قبر میں اُتری اور اس کے اُترتے ہی پنوں نے سر اُٹھا کر اپنی صورت دکھائی۔ سر سے کمر تک اس کا جسم نظر آتا تھا اور سسّی دونوں ہاتھوں سے اس کی کمر مضبوط پکڑے ہوئے تھی تاکہ کوئی اسے پھر نہ چھین لے جائے۔

اس میں شک کہ اس روایت کے بعض حلکڑے خالص کہانی ہیں اور ہمیں نہیں معلوم کہ سسّی پنوں کا یہ مقبرہ اب بھی وہاں پایا جاتا ہے یا نہیں اور اگر پایا جاتا ہے تو سندھ کے محکمۂ آثار قدیمہ نے اس کے متعلق کیا تحقیق کی ہے۔ لیکن نفس واقعہ سے انکار کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

ہم ممنون ہوں گے اگر سندھ کے کوئی صاحب اس روایت پر مزید روشنی ڈالیں گے۔

مذہبی استفسارات و جوابات
یعنے
"من و یزداں" کا دوسرا حصّہ

اس حصّہ میں جن مسایل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے:-
اصحاب کہف - معجزہ و کرامت - انسان مجبور ہے یا مختار - مذہب و عقل - طوفانِ نوح - خضر کی حقیقت - مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں - یونس اور دہانِ ماہی - حُسن یوسف کی داستان - قارون - سامری - علم غیب - وحی کی حقیقت - دُعا و توبہ - لقمان - عالمِ برزخ - یاجوج ماجوج - ہاروت ماروت - حوضِ کوثر - امام مہدی - نورِ محمدی اور پُل صراط - آتش نمرود - علامۂ مشرقی اور قبلہ کا رخ - دعا و توبہ کی حقیقت - نفس و روح - آدم اور شجر ممنوع - لفظ امی کا صحیح مفہوم - معاد وغیرہ -
ضخامت ۲۴۴ صفحات - کاغذ سفید و دبیز - قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے - منیجر نگار

طلسم عالم کی نقاب کشائی

خدا اور کائنات دونوں کا تصور ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ جب تک انسان کو کائنات کی وسعت کا علم نہ تھا اس کا خدا بھی محدود تھا۔ یعنی جب کائنات اس کے نزدیک صرف اسی کرۂ زمین کا نام تھا، تو خدا بھی اسی زمین کے ایک بادشاہ کی حیثیت سے زیادہ کچھ نہ تھا لیکن اس باب میں جوں جوں علم انسانی ترقی کرتا گیا، خدا کی حقیقت بھی واضح تر ہوتی گئی، یہاں تک کہ آج جب کائنات کی وسعت لامتناہی نظر آتی ہے، خدا بھی لامتناہی ہو گیا ہے۔

خدا کے تصور میں اس اصلاح و ترقی کا سبب صرف فلکیات ہے اور فلکیات میں بھی خصوصیت کے ساتھ دوربین جس کی ایجاد کا سہرا گلیلو کے سر ہے۔

گلیلو کے بعد دوربین سازی میں تدریجی ترقی ہوتی رہی اور کائنات کے پردے بھی آہستہ آہستہ اٹھتے رہے لیکن کائنات خدا کا اتنا زبردست کارنامہ ہے کہ اس کی حقیقت کا پورا علم انسان کو غالباً کبھی نہ ہو سکے گا اور علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسان کی حیرت بھی بڑھتی جائے گی یہاں تک کہ سوائے اعتراف عجز کے اور کوئی چارۂ کار باقی نہ رہے گا۔ یہ منزل تصوف کی منزل ہے، مذہب کا حقیقی مسلک ہے، جس کو مذہب اور تصوف کی دنیا کا انسان بغیر کسی سبب کے تسلیم کرتا تھا، لیکن اب علم کی ترقی نے اس کا سبب بھی معلوم کر لیا ہے اور خدا کا وجود علمی دلایل کی حدود میں آگیا ہے۔

بیس سال اس طرف کی بات ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی دوربین کی طیاری کا کام امریکہ میں شروع ہوا۔ یہ دوربین اس نمونہ پر طیار کی جا رہی تھی جو ۱۶۷۲ء میں سر اسحاق نیوٹن نے پیش کیا تھا۔ جدید دوربین فن انجینری اور ریاضی کا معجزہ سمجھی جاتی ہے اور اس کے شیشہ کا قطر ۲۰۰ انچ کا ہے۔ بہ ظاہر ۲۰۰ انچ بہت معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ اس شیشہ کی طیاری میں پورے ۲۰ سال صرف ہوئے اور جب یہ شیشہ دوربین میں لگایا گیا تو پتہ چلا کہ جس شیشہ کی پالش سالہا سال سے ہو رہی تھی اس کے کنارے کچھ زیادہ دبیز ہیں۔ لیکن کیا آپ یہ سن کر یقین کریں گے کہ یہ دبازت ایک انچ کے کروڑویں حصہ سے بھی کم ہے اور وہ کونسا آلہ ایسا ہے جس سے اس حباب آسا بلکہ پردۂ حباب سے بھی کم دبازت کا علم حاصل ہوا ہے۔ بہرحال اب پھر اس کے کنارے کو رگڑا جا رہا ہے اور کم از کم ایک سال اور اس کے لئے درکار ہوگا۔

جب یہ دوربین طیار ہوجائے گی تو انسانی آنکھ کیا کیا دیکھ سکے گی، اس کی تفصیل مشکل ہے۔ لیکن جو توقعات اس سے وابستہ ہیں وہ بہت بلند ہیں۔ یہ دوربین دراصل دوربین سے زیادہ کچھ اور چیز ہے جس میں ایک طرف دس لاکھ انسانی آنکھوں کی قوت بصارت پائی جاتی ہے اور دوسری طرف وہ ایک بہت بڑا فوٹو کا کیمرا بھی ہے جس کے ذریعہ سے ہم فضائے بسیط کے ان ستاروں کا حال بھی معلوم کرسکیں گے جن کی روشنی ہم تک ۱۰ کروڑ سال میں پہونچتی ہے۔

اس سے قبل سب سے بڑی دوربین سوا نچ کے شیشہ کی وہ تھی جو مونٹ ولسن پر قایم تھی۔ اس کے ذریعہ سے ہم کو صرف ۳۰ لاکھ نوری سال کے فاصلہ پر واقع ہونے والے ستاروں کا حال معلوم ہوا اور ماورائے کہکشاں نظام شمسی اور دریافت ہوئے جو ہمارے نظام شمسی سے بہت دور واقع ہیں۔ اس کامیابی سے خیال پیدا ہوا کہ اگر کوئی دوربین اس سے زیادہ قوی طیار کی جائے تو اور زیادہ انکشافات ہوسکتے ہیں، چنانچہ راکفلر نے جدید دوربین کی طیاری کے مصارف اپنے سر لئے اور بیس سال قبل اس کی طیاری شروع ہوئی۔ درمیان میں جنگ کی وجہ سے اس کی طیاری ملتوی ہوگئی تھی لیکن جنگ کے بعد پھر کام شروع کیا گیا اور اب وہ بالکل طیار ہوکر رصدگاہ پالومر میں نصب کی گئی۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ ہم اس دوربین سے کیا کیا دیکھ سکتے ہیں، لیکن اس کی دوررسی کا یہ عالم ہے کہ اگر فضا میں ۲۰ ہزار میل کی دوری پر کوئی موم بتی روشن کی جائے تو وہ بھی اس سے نظر آسکتی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اس کی مدد سے ہم کو بہت سے ستاروں کے اجزاء ترکیبی بھی معلوم ہوسکیں گے۔

یہ دوربین جس رصدگاہ میں نصب کی گئی ہے اس کے گنبد کا قطر ۱۳۷ فٹ ہے اور بلندی ۱۳۵ فٹ۔ مشینری جو اس دوربین کے شیشہ کو حرکت دیگی، اس کا وزن ایک ہزار ٹن ہے اور ایک موٹر کے ذریعہ سے اس کو متحرک کیا جائے گا۔

الغرض یہ دوربین فن انجینیری اور ریاضی کا بہت بڑا کارنامہ ہے اور اس کے ذریعہ سے طلسم کائنات کے بہت سے راز معلوم ہوسکیں گے۔

جھوٹا اشتہار دینا حرام ہے جس سے زیادہ مصیبت یہ ہے کہ اس کی کوئی ثبوت صداقت نہیں ہے، لانثا و لانثا آپ کا فعل ہے

مجون غنی یہ دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کرچکی ہے کوئی دوا اس کے مقابلہ میں نہیں ہے، جوان، بوڑھے سب کھاتے ہیں اس دوا کے لئے اکسیر صفت ہے، ہزاروں قیمتی ادویات اور کشتہ جات بیکار ہیں۔ اس سے بھوک اس قدر بڑھتی ہے کہ دو وقت کا کھانا دو وقت اور بھوک خود بخود پیدا آنے لگتی ہے، اس کو مثل آبحیات کے تصور فرمایئے اس کے استعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کرلیجئے۔ ایک شیشی کے استعمال سے اس کے جسم میں اضافہ وزن کا پتہ چلے گا۔ اس کے استعمال سے اعضاء رئیسہ کو مضبوطی حاصل ہوگی۔ یہ دوا فضا دماغ کو مثل گلاب کے پھول کے تازہ اور مثل گلدان کے درخشاں بنا دے گی یہ دوا فروخت نہیں ہے بلکہ ہزاروں مایوس العلاج اس کے استعمال سے بالکل تندرست ہوچکے ہیں۔ یہ ہدایت درج ہے۔ یہ دوا ہر مہینہ سولہ روپیہ کے حساب سے آپ کو بھیجی جائے گی۔ اقصد اسکی صفت تحریر نہیں کرسکتے۔ تقویٰ یہ ہے کہ آپ جب تک دیکھ نہ لیں اس سے بہتر قوی دوا دنیا بھر میں نہیں ہے نہیں آسکتی۔ تجربہ کرکے دیکھ لیجئے اس سے بہتر قوی دوا دنیا بھر میں نہیں ہے قیمت فی شیشی (۲۴ خوراک) چار روپیہ (للہ صدقہ) (نوٹ) فایدہ نہ ہو تو قیمت واپس۔ فہرست دوا فالج مفت منگائیے میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے نشانوں سے ہوشیار رہیے۔ میری ۳۰ سالہ شہرت پر بھروسہ کیجئے

پتہ:- حکیم یا بت علی پنچ نمبر زبان فروش کلام

(عالم شہزادی مولانا کے روم صاحب)

محمود فرخ بمبئی۔ یہ۔ یہ۔ فی

آٹمی انسان

اگر آپ سے یہ کہا جائے کہ وہ وقت دور نہیں جب موجودہ انسان کی جگہ آٹمی انسان لے لیگا۔ تو آپ کو حیرت ہوگی اور شاید سمجھ میں بھی نہ آئے کہ آٹمی انسان سے کیا مراد ہے۔ آٹمی انسان سے مراد وہ انسان نہیں جو آٹم کا استعمال کرے گا بلکہ بالکل ایک نئی نسل جو استعمال آٹم کے اثرات سے وجود میں آئے گی، اور جس کی ذہنیت موجودہ انسان سے بالکل جدا ہوگی۔ امریکہ میں آٹم کے جو تجربات عمل میں آرہے ہیں اگر ان کے عواقب و نتائج کا علم دُنیا کو ہو جائے تو شاید انسان چیخ اُٹھے اور ان حکومتوں کے تختے اُلٹ دے، جو آٹم کے تجربات کر رہی ہیں، لیکن اول تو دُنیا کو کچھ خبر نہیں کہ پس پردہ کیا ہو رہا ہے علاوہ بریں اس کا بھی امکان ہے کہ آٹمی تجربات سے نوع انسانی کی تباہی کی جگہ ذہنی اصلاح و ترقی کا کام لیا جائے۔

اگرچہ یہ تجربات اس وقت تک صرف جانوروں اور نباتات تک محدود ہیں، لیکن ان سے جو نتائج سامنے آرہے ہیں وہ اس قدر عجیب و غریب ہیں کہ ممکن ہے علماء سائنس ان سے ناجائز کام لیں اور دنیا ایک نئی مخلوق سے معمور ہو جائے جس کو ہم آٹمی انسان کہہ سکتے ہیں۔

پھر اگر یہ اندیشہ پورا ہو گیا اور علماء سائنس نے آٹمی تجربات متفقہ طور پر بند نہ کئے تو آٹمی انسان کو ضرور پیدا ہونا ہے۔ دو سال کے اندر ہی امریکی تجربہ گاہوں سے یا دس سال کے بعد روسی تجربہ گاہوں سے ۔ !

آٹمی انسان کیسا ہوگا۔ اس کا انحصار اس کے پیدا کرنے والوں پر ہے۔ اگر وہ دنیا میں امن و سکون کے لئے پیدا کیا گیا تو وہ ایسا انسان اعلیٰ ہوگا جس کی اہل یونان توقع کرتے تھے اور جس کی فرضی قوتوں کے فرضی افسانے گھڑے جاتے تھے، لیکن اگر وہ جنگ و فساد کے لئے پیدا کیا گیا تو پھر اس کی تباہکاریوں کی انتہا نہ ہوگی، نہ اس کے پاس ضمیر ہوگا نہ کوئی احساس اخلاق۔ وہ ایک عفریت ہوگا حد درجہ خونخوار اور محض سفاکی و خونریزی اس کی زندگی کا مقصد ہوگا۔

لیکن یہ آٹمی انسان پیدا کیونکر ہوگا اور سائنس داں کس طرح اپنے اختیار سے ایسا انسان پیدا کر سکیں گے ... اس کا جواب بہت آسان ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ اولاد میں ماں باپ دونوں کی باتیں پائی جاتی ہیں، کان باپ کا سا ہے تو ناک ماں کی، آنکھ ماں کی ہے تو ہونٹ باپ کے، الغرض نہ صرف ظاہری اعضا بلکہ اندرونی اعضاء میں بھی والدین کی بہت سی باتیں بچوں کو ورثہ میں ملتی ہیں۔

تحقیق سے ماہرین حیاتیات نے اس کا سبب معلوم کرلیا ہے اور وہ یہ کہ زندہ خلایا جو پیدایش یا تخلیق انسان کا باعث ہوتے ہیں ان میں بہت سے ریشے ماں باپ کے مادۂ تولید کے پائے جاتے ہیں اور وہی ملکر صورت و شکل، رنگ و مزاج پیدا پیدا کرتے ہیں - اعضاء کی وضع، ناک آنکھ کی ساخت، بصارت و سماعت، اعصابی احساس، امراض کے رد و قبول کی اہلیت، ذہنی رجحانات وغیرہ سب انھیں ریشوں سے پیدا ہوتے ہیں اور ان ریشوں کی تقسیم کے ساتھ والدین کی خصوصیات بھی بچوں میں منتقل ہوتی رہتی ہیں - اس وقت تک ان خلایا اور ریشوں کا علم تو تھا لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ ان خلایا اور ریشوں کی طبعی خصوصیات میں تبدیلی بھی ہو سکتی ہے - جب پچھلی جنگ میں ہیروشیما پر امریکہ نے آٹم بم گرایا تو انسانی ہلاکت تو خیر اس سے جیسی اور جتنی ہوئی ظاہر ہی ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ جو عورتیں حاملہ تھیں، ان پر عجیب و غریب اثر ہوا، اور وہ یہ کہ ان کے بچے اس قدر غیر فطری ہیبتناک شکل کے پیدا ہوئے کہ ان میں سے اکثر کو فنا کر دینا پڑا - اس واقعہ نے ماہرین سائنس کو چونکا دیا اور وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ آٹمی شعاعوں سے ان خلایا اور ریشوں میں ایسی تبدیلیاں پیدا کی جا سکتی ہیں کہ ان کے فعل تخلیق و تولید پر تو اثر نہ پڑے لیکن بچوں کی صورت و شکل اور ان کے ذہن و دماغ کے رجحانات بدل جائیں - چنانچہ امریکہ کی حکومت نے ماہرین حیاتیات کو اجازت دیدی کہ وہ زندہ خلایا پر آٹم کی شعاعوں کے اثرات کا تجربہ کریں - اور اب وہاں کے بڑے بڑے ماہرین فن اس کوشش میں منہمک ہیں کہ وہ آٹمی شعاعوں کی مدد سے ایک ایسا انسان پیدا کریں جو موجودہ انسان سے نہ صرف ظاہری اعضا بلکہ دماغی ساخت کے لحاظ سے بھی بالکل نیا انسان ہو اور یہی وہ مخلوق ہے جس کا نام ہم نے آٹمی انسان رکھا ہے -

یہ تجربات ابھی تک صرف جانوروں اور نباتات پر کئے جا رہے ہیں، چنانچہ میگسیکو میں سانپ کی ایک خاص قسم پر جسے ہم "دو موہی" کہہ سکتے ہیں، تجربہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس کے غدۂ درقیہ پر آٹمی شعاعیں ڈالنے سے اس کا نشو و نما بالکل ختم ہو گیا — اسی طرح نباتات پر بھی تجربہ ہو رہا ہے اور اب حاملہ عورتوں یا مردوں کے مادۂ تولید پر تجربہ کر کے دیکھا جائے گا کہ آٹمی اثرات سے کام لیکر بچہ میں کیا کیا جسمانی و ذہنی تبدیلیاں کی جا سکتی ہیں اور اس کو کتنا عجیب الخلقت بنایا جا سکتا ہے -

بہرحال آٹمی تجربات کی یہ نوعیت بڑی خطرناک ہے، کیونکہ اس وقت تک سائنس کے اور جتنے تجربات ہوئے ہیں انھوں نے بھی کسی نہ کسی طرح نوع انسانی کو نقصان ہی پہونچایا ہے اور اگر ان آٹمی تجربات کی یہی نوعیت رہی تو اس میں شک نہیں کہ دنیا کو اس سے بہت بڑا نقصان پہونچتا ہے اور آیندہ انسان کی جگہ کرۂ ارض پر صرف عفریت، و شیاطین ہی نظر آئیں گے جن کا مشغلہ سفاکی و خونریزی کے سوا کچھ نہ ہوگا اور جن کی تنہا صفت ان کی شقاوت و بے رحمی ہوگی -

یہاں وہاں سے

بگ بن (Big Ben) لندن کی اس مشہور گھڑی کا نام ہے جس کے گھنٹوں کی آواز آج ریڈیو کے ذریعہ سے دُنیا کے ہر گوشہ میں سُنی جاتی ہے۔ جب ۱۱ر نومبر ۱۹۱۸ء کو اس نے آہستہ آہستہ گیارہ بجائے تو برطانیہ کی ساری آبادی کو معلوم ہوگیا کہ لڑائی ختم ہوگئی اور جب ۲۱ سال بعد ۳ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو اس نے گیارہ بجائے تو تمام اہل برطانیہ نے سمجھ لیا کہ دوسری جنگ پھر شروع ہوگئی ہے۔

بگ بن دراصل گھڑی کا نام نہیں بلکہ اس کے ساڑھے تیرہ ٹن کے گھنٹے کا نام ہے جس سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ جسوقت یہ گھڑی طیار ہوئی تو دارالعوام میں اس کے نام تجویز کرنے کا سوال پیدا ہوا اور سر بنجامن ہال کے نام پر اس کا نام تجویز ہوا۔

گھڑی کے ہر ڈایل کا قطر ۲۳ فٹ ہے۔ ہندسے دو فیٹ لمبے ہیں اور منٹ کی خالی جگہ کا رقبہ ایک مربع فٹ ہے۔ اس کی سوئیاں تانبہ کی ہیں اور ۱۴ فٹ لمبی۔ ان کا وزن دو ہنڈرویٹ ہے اور چار آدمی انھیں اُٹھا سکتے ہیں۔

ٹھیک وقت بتانے کے لئے ایک خاص طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک پنڈولم میں ایک طشتری سی لگی ہوئی اور جب گھڑی سست ہونے لگتی ہے تو اس طشتری پر ایک پنی یا آدھی پنی کا سکہ رکھدیا جاتا ہے تاکہ اس کے وزن سے رقاص کی حرکت کچھ بڑھ جائے، اور جب گھڑی ٹھیک وقت دینے لگتی ہے تو یہ سکہ ہٹا لیا جاتا ہے۔

ہر ڈایل کے نیچے لاطینی حروف میں ایک تحریر منقوش ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ "خدا ملکہ وکٹوریا کو محفوظ رکھے"۔

جب تک پارلیمنٹ کا اجلاس ہوتا رہتا ہے اس کے ٹاور میں برابر روشنی رہتی ہے۔

اس گھڑی کا نقشہ لندن کے ایک گھڑی ساز نے طیار کیا تھا جس کا نام ای۔ بے ڈنٹ تھا لیکن اپنا کام ختم کرنے سے پہلے ہی ۱۸۵۳ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔ گھڑی ۱۸۵۴ء میں طیار ہوگئی تھی لیکن ٹاور جس میں اس کو نصب کیا جاتا تھا پانچ سال کے بعد طیار ہوسکا۔

جب اس گھڑی کے نصب کرنے کا سوال پیدا ہوا تو بہت سی دقتیں سامنے آئیں۔ ایک یہ کہ اس کے لئے جو ۱۶ ٹن وزن کا گھنٹہ طیار کیا گیا تھا اس میں دراز آگئی تھی، اس لئے اس کو توڑ کر پھر ڈھالنا پڑا اور وزن کم کردیا گیا۔ اس کے علاوہ اتنے وزنی گھنٹے کو اُٹھا کر اتنی بلندی پر لیجا کر قایم کرنا بھی آسان نہ تھا۔ جب گھڑی نصب کردی گئی تو معلوم ہوا کہ سوئیاں بہت وزنی ہیں اور وہ حرکت نہیں کرتیں۔ اس لئے دوسری سوئیاں کم وزن کی طیار کی گئیں۔ ان تمام مراحل

سے گزرنے کے بعد ۲۱ مئی ۱۸۵۹ء سے اس نے اپنا کام شروع کیا اور اس وقت تک پورے ۹۰ سال سے اپنی خدمت انجام دے رہی ہے۔

اس دوران میں صرف ایک بار اب سے ۵ سال قبل پنڈولم کی کمانی ٹوٹ جانے کی وجہ سے بند ہوئی۔ ۸۴ سال تک اس کے کھینچنے کا انتظام یہ رہا کہ دو آدمی مسلسل ۵ گھنٹے روزانہ کام کرکے تین دن میں اسے پورا کرتے تھے، اسکے بعد ایک موٹر لگایا گیا جس کے ذریعہ سے ہفتہ میں تین بار اسے کو کا جاتا ہے اور ہر بار ۴۰ منٹ صرف ہوتے ہیں۔

مشین کی خرابی کی وجہ سے یہ آج تک بند نہیں ہوئی۔ البتہ دوسرے اسباب ضرور ایسے پیدا ہوئے کہ کبھی کبھی وہ بند ہوگئی۔ مثلاً ایک بار چوہوں نے اس کے اندر اپنا گھونسلہ بنالیا، ایک مرتبہ مینیجر اپنی سیڑھی اس کے اندر رکھ کر بھول آیا، ایک بار کوئی کاریگر اپنا ہتوڑا چھوڑ آیا۔ ۱۹۴۱ء میں ہوائی حملوں کی وجہ سے بھی اس کو کبھی کبھی رُک جانا پڑا۔

جُوجُو

ہندوستان کے بعض حصّوں اور خصوصیت کے ساتھ یو۔پی کے قصبات میں دیکھا جاتا ہے کہ جب بچّے ضد کرتے ہیں تو انھیں ڈرانے کے لئے مائیں کہتی ہیں کہ "جُوجُو آیا" میں نے بھی یہ الفاظ سُنے تھے اور میں بھی جُوجُو کو بہت ڈراؤنی چیز سمجھا تھا، لیکن اس کی حقیقت سے واقف نہ تھا، بعد کو معلوم ہوا کہ جُوجُو افریقہ میں جادو ٹونے کو کہتے ہیں اور حال ہی میں لارنس ہائنس نے جو ۲۰ سال افریقہ میں رہ چکا ہے، جُوجُو کے بعض عجیب و غریب واقعات لکھے ہیں، افریقہ کا جُوجُو ہندوستان کیسے پہونچا، اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

لارنس لکھتا ہے کہ "ایک بار میں افریقہ میں سفر کر رہا تھا کہ ایک مزدور نے دفعتاً اپنا بوجھ سر سے اُتار پھینکا اور درخت کے نیچے سر پکڑ کر بیٹھ گیا، میں نے پوچھا کیا طبیعت خراب ہے اس نے جواب دیا کہ "نہیں میں مر رہا ہوں" اور تھوڑی دیر میں مر گیا۔ دوسرے مزدوروں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ پچھلی رات جس گاؤں میں ہم نے قیام کیا تھا وہاں اس مزدور نے بعض مذہبی مراسم ادا نہ کئے تھے اور وہاں کے جادو ٹونا کرنے والے (Witch Doctor) نے اس کو بد دعا دی تھی، اسی لئے مر گیا۔

بہت سے لوگ جُوجُو کو محض واہمہ سمجھتے ہیں اور اس کی علمی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ افریقہ کے باشندے چونکہ جُوجُو اور جادو ٹونے کے سخت معتقد ہیں اس لئے وہ اپنے اعتقاد سے متاثر ہوکر خود ہی ہلاک ہو جاتے ہیں، لیکن اس کو کیا کیجئے گا کہ یوروپ کے جو لوگ وہاں مقیم ہیں، اور جُوجُو کو بالکل مہمل چیز سمجھتے ہیں وہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

اس سلسلہ میں ایک ڈچ سوداگر کا واقعہ سننے کے قابل ہے۔ یہ بہت سخت آدمی تھا اور جُوجُو کا بالکل قایل نہ تھا، ایک رات وہ شراب کے نشہ میں عبادت گاہ میں گھس گیا۔ وہاں کے جادو ٹونا کرنے والے مذہبی پوجاری نے اس سے نکل جانے کو کہا۔ اس نے مکا مار کر اس کو گرا دیا اور اس کے بُت پر تھوک کر چلا آیا۔

پوجاری نے اس کے چلے جانے کے بعد اپنے جادو ٹونے کا عمل شروع کیا اور رات بھر منتر پڑھتا رہا۔ صبح کو

سوداگر اپنے خیمہ کے اندر مردہ پایا گیا۔ کمشنر ضلع کو خبر پہونچی تو اُس نے تحقیقات شروع کی۔ ڈاکٹر نے معاینہ کرکے رپورٹ لکھی کہ موت کا سبب بظاہر کوئی نہیں معلوم ہوتا۔ البتہ چہرہ اور آنکھوں کو دیکھ کر کہا جاتا ہے کہ موت کا سبب صرف خوف تھا۔

ایک اور واقعہ سنئے :۔

اڈسلے جہاز کے کپتان کو دفعتاً حکم ملا کہ وہ کانگو میں خلیج منڈا سے شہتیریں لدوا کر روانہ ہو۔ جہاز کے ملازموں میں ایک لڑکا جان کانگو کا بھی تھا، اس نے جانے سے انکار کر دیا، پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ "وہاں جُوجُو ہے اور میں وہاں پہونچکر مرجاؤں گا"۔ زیادہ تفصیل دریافت کی گئی تو اس نے کہا کہ "میرا باپ مذہبی ساحر ہے اور وہ مجھے بھی جادو ٹونے کی تعلیم دینا چاہتا تھا، لیکن میں نے اس کو پسند نہ کیا، اور جب زیادہ زور دیا گیا تو میں اس کو مار پیٹ کر کے چلا آیا"، کپتان نے کہا کہ یہ بات سات آٹھ سال کی پرانی ہوگئی ہے، اس لئے خوف کی کوئی وجہ نہیں" اس نے کہا کہ "جُوجُو کبھی پرانا نہیں ہوتا اور میں وہاں گیا تو یقیناً مرجاؤں گا"۔ کپتان نے کہا تم ڈرو نہیں اور اس کی حفاظت کے لئے دو سپاہی پہرہ لگا دیا۔

رات کو دو بجے ایک آدمی گھبرایا ہوا آیا اور اسے جگایا۔ یہ عرشہ پر پہونچا تو دیکھا پہرہ کے دونوں سپاہی غافل پڑے سو رہے ہیں اور جان غائب ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ رات کو دو آدمی جُوجُو کی شکل کے آئے اور ان کو دیکھتے ہی سپاہی بیہوش ہو گئے۔ اس کے بعد جان ان کے ساتھ چلا گیا۔

چاندنی رات تھی، کپتان نے حکم دیا کہ فوراً اس کی تلاش شروع کی جائے، چنانچہ بندوقیں لیکر پارٹی جان کی تلاش میں روانہ ہوئی۔ بہت جستجو کے بعد وہ ایک مندر میں پہونچے تو دیکھا کہ جان مرا پڑا ہے اور اس کے تمام اعضا کاٹ دئے گئے ہیں۔

کپتان کو سب سے زیادہ حیرت اس بات کی تھی کہ ان لوگوں کو کیونکر معلوم ہوا کہ جان اس جہاز سے آرہا ہے، لیکن اس کا کوئی جواب اسے نہ مل سکا۔

افریقہ کی مغربی حکومتیں وہاں جُوجُو کی سخت مخالف ہیں اور جادو ٹونا کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جاتی ہیں، لیکن کامیابی نہیں ہوتی۔ ایک بار کوئی جوجو والا عدالت میں پیش ہوا۔ اس نے کہا کہ "اگر تم مجھے سزا دو گے تو اندھے ہو جاؤ گے" اس نے یہ کہکر اپنی جیب سے کوئی چیز نکالی جس پر کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ یہ دیکھتے ہی افریقہ کے جو لوگ اس کے خلاف شہادت دینے آئے تھے چیخکر بھاگے، سپاہی نے وہ چیز اس کے ہاتھ سے چھین لی اور کپڑا کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ مرغ کا خشک کیا ہوا سر تھا۔ سپاہی نے اس کو دیکھتے ہی پھینک دیا اور بولا کہ "مجھے کچھ نظر نہیں آتا" اس کے بعد جج نے بھی اسے دیکھا اور اس کی بینائی بھی جاتی رہی۔

افریقہ کے ایک ضلع میں ایک انگریز اسمتھ نامی ڈپٹی کمشنر مقرر ہو کر آیا۔ اس نے عہد کیا کہ میں جوجو کو ختم کئے بغیر نہ رہونگا سب سے بڑی مشکل عدالت کو یہ پیش آتی ہے کہ گواہی دینے والے سب افریقہ کے باشندے ہوتے ہیں اور وہ ڈر کے مارے

گواہی نہیں دیتے۔ ایک بار کوئی جوجو اسمتھ کے سامنے لایا گیا، لیکن گواہ بھاگ گئے۔ اس نے جوجو کو حوالات میں بند کردیا اور حکم دیا کہ گواہوں کو پھر لایا جائے۔ جوجو جب حوالات میں بند کیا گیا تو اسمتھ نے خود اس کی تلاشی لی اور کوئی چیز اسکے پاس نہ رہنے دی۔ رات کو سپاہی نے اطلاع دی کہ جوجو نے حوالات کے اندر آگ جلالی ہے اور کچھ منتر پڑھ رہا ہے۔ اسمتھ گیا تو معلوم ہوا کہ جو کمل اسے اوڑھنے کو دیا تھا، اسی کو اس نے جلاکر روشنی کرلی تھی۔ اسمتھ نے اس سے بہت کچھ پوچھا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور برابر منتر پڑھتا رہا۔ اسمتھ اپنے بنگلہ پر واپس آیا تو دیکھا کہ اس کا بچہ ۶ سال کا نہایت تیز بخار اور ہذیان میں مبتلا ہے۔ ڈاکٹر بلائے گئے انھوں نے کہا کہ بخار بہت عجیب قسم کا ہے اور وہ اس کا علاج نہیں کرسکتے مجبوراً اسمتھ، جوجو کے پاس گیا اور کہا کہ "میں تم کو رہا کرتا ہوں لیکن میرے بچے کو اچھا کردو"۔ جوجو نے اسمتھ سے اس کا رومال مانگا اور اس پر کچھ افسوں پھونک کر کہا کہ "بچہ کے سر پر اسے رکھدو"۔ اسمتھ دوڑا ہوا گیا اور رومال بچہ کے سر پر رکھدیا۔ رومال رکھتے ہی بخار اور ہذیان بالکل ختم ہوگیا۔

اس کے بعد اسمتھ وہاں کئی سال رہا لیکن پھر نہ کسی جوجو کو گرفتار کیا نہ اسے سزا دی۔

دلائی لاما کیونکر ملتا ہے

تبت میں بودھ مذہب رائج ہے اور اس کے سب سے بڑے مہنت کو دلائی لاما کہتے ہیں۔ جب وہ مرجاتا ہے تو اس کا جانشین تلاش کرنے میں بڑی زحمت ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ شادی تو کرتا نہیں کہ اس کے اولاد پیدا ہو اور وہ اس کی جانشین قرار دیجائے اور نہ حکومت کی پریسیڈنٹ کی طرح لوگوں کی رائے سے اس کا انتخاب ہوتا ہے۔ بلکہ دلائی لاما ڈھونڈا جاتا ہے۔

ان کا عقیدہ ہے کہ دلائی لاما کے مرنے کے بعد دو سال کے اندر وہ کسی عورت کے رحم میں جنم لیتا ہے اور پھر بچہ کی صورت سے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس بچہ کا علم کیونکر ہوسکتا ہے اور تبت کے ہزاروں لاکھوں عورتوں میں سے کس کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ اس کے رحم میں دلائی لاما نے جنم لیا ہے۔

اس باب میں وہ پچھلے لاماؤں کی روح سے مدد لیتے ہیں اور استخارہ کرتے ہیں۔ تبت میں بہت سی جھیلیں ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان سے مستقبل کے بہت سے واقعات معلوم ہوجاتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور جھیل وہ ہے جو لہاسا کے جنوبی مشرقی حصہ میں واقع ہے جہاں پہلا دلائی لاما پیدا ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا پانی نیلا ہے، لیکن اگر پہاڑی کی طرف سے دیکھو گے تو ہوا پیدا ہوگی اور پانی کو سفید کردے گی۔ پھر اس میں ایک سوراخ یا بھنور نمودار ہوگا جس کا رنگ گہرا نیلا ہوگا۔ اس سوراخ کے اوپر بادل کے ٹکڑے پیدا ہوتے ہیں اور ان بادلوں کے نیچے آیندہ واقعات کی صورتیں نظر آتی ہیں۔

چنانچہ اس جھیل سے دلائی لاما کے متعلق استخارہ کیا جاتا ہے۔ تمام پجاری جمع ہوکر یہاں پہونچتے ہیں اور وہاں آیندہ

دلائی لاما کی صورت دیکھ لیتے ہیں۔

جب تیرھویں دلائی لاما کی تلاش کا مسئلہ سامنے آیا تو اس جھیل میں اس گھر کی صورت نظر آئی جہاں دلائی لاما پیدا ہوا تھا اور گھر کے پاس ایک درخت شفتالو کا بھی نظر آیا۔ اس رات تمام پجاری تلاش میں نکلے اور آخر کار انھیں وہ گھر مل گیا جس کا پتہ استخارہ سے چلا تھا، یہاں انھوں نے ایک بچہ کو دیکھا جسے ماں اپنی گود میں لئے ہوئے تھی اور گھر کے پاس شفتالو کا بھی درخت تھا۔

پوجاریوں نے سمجھ لیا کہ یہی بچہ آیندہ کا دلائی لاما ہے، لیکن صرف اسی پر اکتفا نہیں کی جاتی بلکہ بچہ کے سامنے مرنے والے لاما کی چیزیں رکھی جاتی ہیں اور اگر وہ انھیں پہچان لیتا ہے تو پھر پورا یقین ہو جاتا ہے۔ یہ رسم قصر پوٹالا میں ادا کی جاتی ہے جہاں دلائی لاما رہتا ہے۔

جب تیرھواں دلائی لاما مر گیا تو اس کے جانشین کی تلاش مہینوں تک جاری رہی، اور آخر کار مشرقی تبت میں ایک ایسے شہر میں اس کا پتہ چلا جو چین کے حدود میں تھا۔ اول اول تو چین نے اس بچہ کے دینے سے انکار کیا لیکن پھر ۵۰۰۰ پونڈ ادا کرنے پر اجازت دیدی۔

شامِ اَودھ

(ناول)

مصنفہ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ام۔ اے، پی، ایچ، ڈی پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی

جس میں بلدہ حسن و شباب اور سرزمین نغمہ و رنگ یعنی لکھنؤ کی اس معاشرت کی دلچسپ تصویر پیش کی گئی ہے، جس پر ساری دُنیا نے رشک کیا۔ اگر شاہانِ اودھ کے محل خانوں کی رنگ رلیاں، بیگموں کی زبان، لکھنوی محاورے اور مشرقی تمدن کے ڈوبتے ہوئے سورج کی شفقی رنگینی دیکھنا ہے تو اس ناول کو ضرور ملاحظہ فرمائیے۔

حجم ۲۷۴ صفحات۔ مجلد۔ معہ رنگین گرد پوش۔ قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

مہدی آخرالزّماں سے!

باوجودیکہ شریعت بھی ہے قرآن بھی ہے
علم و ایقان بھی ہے، حکمت و عرفان بھی ہے
لوگ کہتے ہیں کہ پھر آپ نمایاں ہوں گے!
کیا کوئی کعبہ نیا اور بھی ہوگا تعمیر؟
کیا کوئی اور بھی قرآن کی ہوگی تفسیر؟
اور پھر کتنے "مسلمان" مسلماں ہوں گے؟
کیا یہ اعجاز دم خلوتیاں کچھ بھی نہیں،
کیا یہ "روزے" یہ "نمازیں" یہ اذاں کچھ بھی نہیں،
کیا ضمیروں کے بدلنے کے بھی امکاں ہوں گے؟
کیا کفن پوش نہ پھر کعبے کی عصمت ہوگی
کیا نہ پھر عام ضمیروں کی تجارت ہوگی
کیا نہ سستے سرِ بازار یہ "ایماں" ہوں گے؟
میرے "تاجوں" کے نہ افلاس سے کیا لیں گے خراج
کیا ہوا کوئی نہ پوچھے گی چراغوں کا مزاج
کیا "سیاست" کے بھی ناوک نہ پر افشاں ہوں گے؟
اور یہ لوگ! جو مشہور ہیں "غم خوارِ حسینؑ"؟
جن کے ماتم سے فروزاں ہے چراغِ کونین!
کیا طلب گارِ "رفو" اِن کے بھی "داماں" ہوں گے؟
یہ تو کہتے ہیں کہ "ناجی" ہیں وہی "گرگ" تمام
جن کے آنسو ہیں شہیدوں کے لہو کا نیلام!
اِن کے "اشکوں" کے تو یزداں پہ بھی احساں ہوں گے!

لیکن "اشکوں" کی صداقت کا بھی ہوگا جو حساب
اور اُٹھیں گے جو "ضمیروں" کی خباثت سے نقاب
شمرؔ و بوجہلؔ نہ کیا سر بگریباں ہوں گے ؟
سیکڑوں روتے ہوئے "گرگ" ہزاروں "اژدر"
آستینوں میں چھپائے ہوئے اپنے خنجر !
آپ کی سمت ؔ ہر شہر خراماں ہوں گے ؟
جمع گر اتنے یزیدوں کی جماعت ہو گی ،
اور شرمندہ جو شبّیر کی سیرت ہو گی ،
سب تو سب آپ بھی کچھ کم نہ پریشاں ہوں گے !
یہ اگر سچ ہے کہ کردار کے مفلوج فقیر
لائقِ "خُلد" ہیں بے سیرت و اخلاق و ضمیر
ہم "جہنّم" میں بھی "جنّت" کے نہ خواہاں ہوں گے !
جن کے فِتراک میں قبریں بھی ہیں قرآن بھی ہے
کربلاؔ بھی ہے مدینہؔ بھی خراساںؔ بھی ہے
کیا "سفینوں" کے نگہباں وہی طوفاں ہوں گے ؟
کوفہ و شامؔ کی اُمّت ہی نہیں قابلِ دید
ہر طرف زندہ و پائندہ ہیں صدیوں کے یزید !
سر سے پا تک کوئی بوذرؔ کوئی سلماںؔ ہوں گے
فی المَثَل !.... سوئے دکن آپ اگر جائیں گے
کتنے شبّیر نما "شمر" نظر آئیں گے !
دل میں ابلیس، مگر ہونٹوں پہ "قرآں" ہوں گے !
کوئی فرتوت یہودی ! کوئی بوڑھی ہِندہ !
سیکڑوں سال کی ناپاک خباثت زندہ !
رکھ کے سر آپ کے قدموں پہ نَم افشاں ہوں گے !

آئے ہیں کتنے نبی! لوٹ گئے کتنے رسول!
کتنی صبحوں سے ہے اِس خاک پہ کرنوں کا نزول!
کیا "تمدّن" کے درندے کبھی انساں ہوں گے؟

"ماتم" و حج و "زیارت" بھی ہیں مگر "طوفاں خیز"!
یہ ہوائیں بھی ہیں شمعوں سے اگر گرم ستیز!
کیا "شہیدوں" کے "کفن" اس سے بھی ارزاں ہونگے؟

"قدسیوں" کے بھی ہو ماتھے پہ اگر خبث کے داغ
کربلا کی بھی ہوا سے نہ بجھا گر یہ چراغ!
کتنے سورج ہیں جو صبحوں سے پشیماں ہوں گے؟

شورؔ علیگ

غزل :- رضاؔ قریشی

یوں لئے بیٹھا ہوں دل میں اُن کی حسرت کے نشاں
جیسے پیچھے چھوڑ جائے گرد کوئی کارواں،

ہائے اُنکے ڈھونڈنے والوں کی سعیِ رائگاں
اب بھی خاکِ رہگذر اُڑتی ہے بنکر کارواں

ہنس رہے تھے گل مری آنکھوں سے آنسو تھے رواں
خارِ گلشن نے جو دامن تھا مکر پوچھا کہاں؟

تھا جہاں سب کے تبسّم کا تبسّم ہی جواب
میں تری اُس بزم سے لایا ہوں اک دردِ نہاں

سنگِ در کو ڈھونڈنے والے ترا سجدہ بخیر!
ہے یہ سب عالم کا عالم آستاں ہی آستاں!

یہ رہائی ہو رہی ہے جانے اب کس قید سے؟
ٹوٹتے تارِ نفس ہیں یا قفس کی تیلیاں!!

رونے والوں تک نہیں محدودِ تنقیدِ الم
کتنے پھول ایسے ملیں گے جن میں کانٹے ہیں نہاں

کون گزرا ہے بنا کر کہکشاں سی راہ میں
کچھ ہیں قدموں کے نشاں اور کچھ ہیں سجدوں کے نشاں

اُن کی بزمِ ناز سے جاتے تو ہو اُٹھ کر رضاؔ
اِس زمیں اس آسماں سے بچکے جاؤ گے کہاں۔؟!

جرأتِ گفتار

کس قدر گلستاں ہیں رنگ و نور کے مدفن
میر کارواں کتنے بن گئے ہیں خود رہزن

کھا لیا اندھیرے نے کتنے برق پاروں کو
ٹوٹنا پڑا آخر بربطوں کے تاروں کو

سَم فشاں حوادث کے کتنے قافلے آئے
کتنی کشتیاں 'ڈوبیں' کتنے چاند گہنائے

بارہا گلابوں کی جان لی ببوٗلوں نے
آدمی کو بہکایا کس قدر رسولوں نے

محوِ خواب ہیں طوفاں آج بھی سفینوں میں
داغ ہیں جبینوں پر، بُت ہیں آستینوں میں،

گوکہ فیضِ موسم سے ہر روش مہکتی ہے
آج بھی شگوفوں میں آگ سی دہکتی ہے

یہ بجھی بجھی شمعیں، یہ اُداس ویرانے
ہو گئے تہی آخر زندگی کے پیمانے

زنگِ یاس و محکومی کھا گیا دماغوں کو
پوجتے رہے لالے اپنے دل کے داغوں کو

ہر نفس میں چنگاری، ہر نظر میں ویرانی
اک سرابِ رنگین ہے یہ عروجِ انسانی

ہو گئی ہیں چہروں پر نقش حسرتیں کیا کیا
ایک ایک ذرّے میں ہیں قیامتیں کیا کیا

پھر نشاط گاہوں پر مسکرائے غم خانے
مسجدیں شرار آگیں، شعلہ گوں صنم خانے

دہر پر تسلّط ہے اک مہیب ظلمت کا
عکس بھی نہیں باقی جلوۂ حقیقت کا

یہ فنا زدہ دُنیا قبر ہے محبّت کی
ہر قدم پہ ملتی ہے لاش آدمیّت کی

موت آکے چھا جائے نو شگفتہ پھولوں پر!
حیف ہے مشیّت کے روح سوز اُصولوں پر

آس کے کھلونوں سے تو نے مجھ کو بہلایا
گاہ آگ برسائی - گاہ خون برسایا

میرے آشیانے پر بجلیوں کی بارش کی
ہاں - مجھے مٹانے کو زلزلوں سے سازش کی

کھُل گیا زمانے پر سحرِ جاوداں تیرا
اب زمین تیری ہے اور نہ آسماں تیرا !!

افسر سیمابی احمد نگری

انتخاب کلام حسرت استاد جرأت

تیرا تو تب اعتبار کیجئے جب ہو وے کچھ اعتبار اپنا

داد یاں دیتا نہیں کوئی کسی کے جور کی ہائے حسرت خوبرو دیوں کے نگر کو کیا ہوا

چلا وہ شوخ عین شدت گریہ میں رخصت ہو مری آنکھوں سے ٹک اشکوں کو تھم لینے نہیں دیتا

پھرا دھر قتل کو آنکھوں سے اشارہ نہ کیا نیم بسمل ہی رکھا کام ہمارا نہ کیا

اے دل اگر تڑپنا تیرا یہی رہے گا کاہے کو تو جئے گا کاہے کو جی رہے گا

رہنے دے مے کو ساقی ہم تو چلے یہاں سے قسمت میں جس کی ہوگا سو جام پی رہے گا

حسرت اگر جنوں ہے تو چاک کر گریباں ناصح کو گر ہے سینا تو پھر بھی سی رہیگا

بھولتا ہی نہیں وہ دل سے اُسے ہم نے سو سو طرح بھلا دیکھا

کل گئے ہم جو پاس حسرت کے کیا کہیں سخت ماجرا دیکھا

راہ میں سنتے تھے کہ ہے بیمار گھر جو پہونچے اُسے موا دیکھا

کل کسی نے جو کہا مرتا ہے عاشق تیرا ہنس کے غیروں کی طرف کہنے لگا اور سُنا

خدا حافظ ہے کیوں محفل میں اسکا نام آیا تھا تڑپنے سے ابھی دل کو مرے آرام آیا تھا

بہاریں ہم کو بھولیں یاد ہے اتنا کہ گلشن میں گریباں چاک کرنے کا بھی اک ہنگام آیا تھا

کل مجھے اس شوخ سے جو درد کا اظہار تھا کیا کہوں گریہ کناں ہر اک پسِ دیوار تھا

جس نے لطف اس کا کہا میں وہ وہیں بولا وہ کے آہ پہلے میرا بھی اسی صورت سے ظالم یار تھا

لب سے کہ تو بھی تو حسرت کی شفا کے واسطے دیکھ آیا ہوں میں کل اس کو بہت بیمار تھا

مطلب نہیں ہے شکوا ان بیمروتوں کا حسرت مجھے ہے رونا اس دل کی حسرتوں کا

کتنے ہی دن گزر گئے ٹکڑے ہو یہ گیا جگر رنگ سرشک ہی ستم کیوں جگری ہے تا ہنوز

ابر مت لاف زنی کر مری ہمچشمی کی ایک دو قطرے تو ہیں دیدۂ گریاں میں ہنوز

قتل کا تو نے جو حسرت کے کیا ہے ساماں کچھ رہا ہے مگر اس بے سر و ساماں میں ہنوز

حسرت مجھے ہے ڈر کہیں آنسو اُبل نہ جائیں رکھتا ہوں جی کا جی ہی میں میں مار مار جوش

دیکھتے ہی شمع کو جاتا ہے پروانے کا ہوش آہ پر رہتا ہے کیونکر اسکو جلجانے کا ہوش

(۳) **مسلسل و مرکب تصویر کشی** ۔ میر انیس کی مصوری کا کمال اس وقت نظر آتا ہے جب وہ کسی واقعہ کی مسلسل تصویر کھینچتے ہیں۔ گو اس قسم کی تصویریں ان کے مرثیوں میں عام طور پر پوری پوری نہیں ملتیں کیونکہ بیچ بیچ میں روایتی باتوں کی طرف بھی شاعر گریز کر جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے لئے تصویر کی طرف سے ہمارا ذہن ہٹ جاتا ہے۔

ان مرکب تصویروں کے ساتھ ہی وہ نفسیات نگاری سے بھی کام لیتے ہیں، جس کو ڈرامائی تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اگر ہم اس کو مصوری کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو بیشک اس میں ایک خوبی پائی جاتی ہے ۔ ڈرامہ اور مصوری کی مرقعہ نگاری میں بہت فرق ہے۔ اس فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے میر انیس کی مصوری کو لوگ ڈرامائی نگاری کہتے ہیں۔ ڈرامہ ایک ایسی صنف ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اسٹیج پر دکھایا جائے اس لئے اس میں کسی فرد کے حرکات و سکنات کا ذکر نہیں ہوتا۔ تمام نفسیاتی کیفیات کردار کے مکالمہ ہی سے ذہن نشین کرائی جاتی ہیں۔ میر انیس کے مرثیوں میں جہاں کہیں بھی نفسیات کی طرف اشارہ ہے وہ مخصوص حرکات کے بیان سے تعلق رکھتا ہے جو مصوری ہے۔ مثلاً انیس کا ایک مصرعہ ہے :۔ "مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسینؑ ہوں" اس مصرعہ میں سر جھکانے کی حرکت خاص نفسیاتی اشارہ ہے انظہار انکسار کی طرف، لیکن یہ اشارہ ڈرامہ میں نہیں ہو سکتا۔

اس سلسلہ میں مرثیہ "ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں" ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں ایک ایسا واقعہ بیان ہوا ہے جو میدان کربلا سے براہ راست تعلق نہیں رکھتا اور اس لئے شاعر بزم نگاری، مداحی اور رزم نگاری کی ان روایات سے بے تعلق ہے جو دوسرے مرثیوں میر انیس کی مسلسل تصویروں کے درمیان آکر ان کے اثر کو کم کر دیتی ہیں۔ میر انیس کا مصوری کی طرف فطری رجحان اس مرثیہ میں ایک حد تک روایتی پابندیوں سے آزاد ہو کر ظاہر ہوتا ہے۔

یہ مرثیہ ان تکلیفوں کے بیان سے شروع ہوتا ہے جو مسافروں کو سفر میں اٹھانا پڑتی ہیں۔ اسکے بعد حضرت مسلم کی شہادت اور ان کے بچوں کا بے یار و مددگار ہو جانا بیان کیا جاتا ہے۔ بچے کس طرح فرار ہو گئے ہیں اور ان کے دشمن حاکم نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ جو کوئی ان کو پکڑ کر لائے گا انعام پائے گا۔ جو لوگ ان بچوں کو کوفہ میں ڈھونڈھتے پھرتے تھے وہ ان کا حلیہ اس طرح بیان کرتے تھے:۔

خورشید سے ماتھے ہیں تو چہرے ہیں قمر سے　　چھوٹے سے عمامے ہیں لپیٹے ہوئے سر سے
گوندھی ہوئی زلفیں بہ سر دوش پڑی ہیں،
آنکھیں کہیں آہو کی بھی آنکھوں سے بڑی ہیں
ہے مہر درخشاں سے فزوں حسن کا پرتو　　مہتاب سے روشن ہیں یہ رخساروں میں ہے ضو
کوفہ سے نکل جانے کی ہے ان کو تگ و دو　　پہنے ہوئے ہیں ہنسلیاں مانند مہ نو
گورے ہیں گلے جلوہ نما کرتوں میں تن ہیں
لب پنکھڑیاں گل کی ہیں، غنچہ سے دہن ہیں

پیشانیاں دونوں کی جو ہیں ماہ منور سجدوں کے چمکتے ہیں نشاں صورت اختر
تعویذوں کی دو ہیکلیں ہیں سینوں کے اوپر ہلتے ہیں ستاروں کی طرح کانوں کے گوہر
بھاگے ہیں برا وقت جو دونوں پہ پڑا ہے
ایک عمر میں چھوٹا ہے کچھ اور ایک بڑا ہے

ان بندوں کو اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ سراپا ہے اور کافی مبالغہ کے ساتھ، مگر ساتھ ہی ساتھ کچھ ایسی تصریحات بھی ہیں جن سے حقیقی تصویر بچوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اس کے بعد اسی مرثیہ میں ہر بند ایک موقع کی مکمل تصویر پیش کرتا ہے

ناکے تلک آپہونچے نہ تھے وہ جگر انگار جو دیکھ لیا ان کو کسی شخص نے اک بار
چلایا کہ بس آگے قدم رکھیو نہ زنہار جاتے ہو کہاں بھاگے ہم آپہونچے خبردار
سنتے ہی اس آواز کو گھبرا گئے دونوں
سر تا بہ قدم بید سے تھرا گئے دونوں

بھائی سے کہا بھائی نے اب کیا کریں بھائی اعدا ہمیں لینے نہیں آئے اجل آئی
افسوس کہیں امن کی جا ہم نے نہ پائی مشکل ہے بہت موت کے پنجے سے رہائی
آتے ہی بس اب برچھیاں تانیں گے ستمگر
منت بھی کریں گے تو نہ مانیں گے ستمگر

کہتے تھے جو آن ہی پہونچے وہ جفا جو اور باندھ لئے رسی سے ان دونوں کے بازو
بچوں پہ اٹھاتا تھا طمانچہ کوئی بدخو کہتا تھا کوئی لے چلو کھینچے ہوئے گیسو
وہ کہتے تھے ہم دام بلا میں تو پھنسے ہیں
بازو کہو پھر کس لئے رسی سے کسے ہیں

جاتے تھے جو روتے ہوئے وہ گیسوؤں والے بازار میں بے تاب تھے سب دیکھنے والے
جلادوں میں معصوموں کی تھے جان کے لالے تکتے تھے ہر اک کو کہ ہمیں کوئی چھڑالے
حال اپنا اشارے سے جتاتے تھے کسی کو
رسی میں بندھے ہاتھ دکھاتے تھے کسی کو

پہونچے انہیں لیکر جو وہ ظالم سر دربار خدام نے کی عرض کہ حاضر ہیں گنہگار
تھا تخت مرصع پہ کھیں عاکم غدار دہشت سے لرزنے لگے بچوں کے تن زار
بیٹھے ہوئے سب کرسیوں پر چھوٹے بڑے تھے
رسی سے بندھے سامنے معصوم کھڑے تھے

دربار سے ان بچوں کے لئے حکم ہوتا ہے کہ زنداں میں ڈال دئے جائیں ۔ زنداں اور اس میں ان بچوں کی تصویر بھی بہتیل ہے اس تصویر میں عام نفسیاتی جزئیات کو بہت خوبی سے پیش کیا گیا ہے :-

تاریک وہ حجرہ تھا مثالِ شبِ ظلمات — معلوم نہ ہوتا تھا کہ کب دن ہوا کب رات
مرقد کے اندھیرے کو بھی اس گھر نے کیا مات — سہمے ہوئے روتے تھے وہ آنکھوں پہ دھرے ہات

تھی پیشِ نظر وصل میں تنہائی کی صورت
بھائی کو نہ آتی تھی نظر بھائی کی صورت

دیوار میں تھے چھید نہ دروازے میں روزن — تھے داغ چراغوں کی طرح سینے میں روشن
وہ صورتیں بھولی وہ غریبی وہ لڑکپن — چپ بیٹھتے تھے پھیروں جھکائے ہوئے گردن

بوندیں بھی پسینے کی چمکتی تھیں زمیں پر
بل کھائی ہوئی زلفیں لٹکتی تھیں زمیں پر

ہر صبح یہ معمول تھا منہ اشکوں سے دھونا — اٹھ اٹھ کے نمازیں کبھی پڑھنا کبھی رونا
دیکھا نہ کبھی خواب میں بھی چین سے سونا — ہر رات کو خاک اوڑھنا اور خاک بچھونا

جز شکرِ خدا منہ سے نہ کچھ کہتے تھے دونوں
رکھ کر تہہ سر ہاتھ کو سو رہتے تھے دونوں

فاقے میں بسر کرتے تھے دن بھر وہ گل اندام — جو مالکِ زنداں تھا وہ آتا تھا سرِ شام
جا بیٹھتے دروازے کے نزدیک وہ گل فام — دیتا انھیں دو روٹیاں اور پانی کے دو جام

تھا خوف زبس ظالم اظلم کے غضب سے
اٹھ اٹھ کے سلام اس کو وہ کرتے تھے ادب سے

مگر نفسیاتی مصوری کی سب سے بہتر مثال اس مرثیہ میں حارث کی تصویر ہے ۔ شاید اس سے بہتر کسی فرد کی نفسیاتی کیفیت کی تصویر کسی اور مرثیہ میں نہیں ملے گی ۔ جب ان صاحبزادوں کو زنداں سے ایک شخص رحم کھا کر بھگا دیتا ہے اور یہ صاحبزادے حارث کی بیوی کے گھر میں پناہ گزیں ہوتے ہیں تو اس وقت حارث اپنے دروازے پر آتا ہے ۔

کھانا بھی نہ کھایا نہ پیا دونوں نے پانی — اور سوئے بہم مسلم مظلوم کے جانی
وہ نیند نہ تھی موت کی گویا تھی نشانی — دروازے پہ آ پہونچا ادھر ظلم کا بانی

چلایا ضعیفہ کو یہ زنجیر ہلا کر
کوسوں کا تھکا آیا ہوں در کھول دے آکر

یہ سُن کے ضعیفہ کا لگا کانپنے اندام بولی یہ بھلا آنے کا ہے کونسا ہنگام
دربار سے ہر روز تو آتا تھا سرِ شام چلا کے وہ بولا میں کہیں تھا تجھے کیا کام
در کھول نہیں آگ لگا دیتا ہوں گھر کو
لے تو نہیں آتی تو گرا دیتا ہوں در کو

در کھولا تو کس غیظ سے آیا وہ بدافعال پھینکا کہیں خنجر کہیں تلوار کہیں ڈھال
تھی ریش تو اُلٹی ہوئی مو چھوں کے کھڑے بال اور دیدۂ بر بین تھے جوں ساغرِ خوں لال
آواز تھی ایسی کہ گزرتی تھی فلک سے
ہلتی تھی زمیں پاؤں کے رکھنے کی دھمک سے

پاس آکے ضعیفہ نے بہت ہاتوں میں کھولا تیوری وہ چڑھائے رہا کچھ منہ سے نہ بولا
کھینچا کبھی خنجر کبھی تلوار کو تولا کہتا تھا کہ دل کا کوئی پھوٹا نہ پھپھولا
ہاتھوں کو کبھی کاٹتا تھا طیش میں آکر
رہ جاتا تھا غصے سے کبھی ہونٹ چبا کر

تیسرا بند خاص طور پر غیظ کی نفسیاتی مصوری کا کمال ہے۔ تلوار۔ خنجر۔ ڈھال کا اِدھر اُدھر پھینکنا، اُلٹی ہوئی داڑھی موچھوں کے کھڑے ہوئے بال، سرخ آنکھیں، اس کی آواز کا زور اور اس کے چلنے کی دھمک یہ سب مل جل کر ایک نہایت اعلیٰ نفسیاتی مرقعہ پیش کرتی ہیں۔

اس قسم کی تصویریں اکثر مرثیوں میں ملتی ہیں مگر واضح رہے کہ سراپا اس دائرہ میں نہیں آتے۔ سراپا میں کسی فرد کی تعریف ہوتی ہے اور اس فرد کے خال و خط کا الگ الگ ذکر کر کے ہر ایک کی مبالغہ کے ساتھ تعریف ہوتی ہے۔ اس تصویر کو ہم کرداری خاکہ بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ کرداری خاکوں میں شاعر کی نگاہ فرد کی انفرادی صفت پر ہوتی ہے اسلئے میر انیس کا فن مصوری ہی کا فن ہے کیونکہ اس تصویر سے ہمارے ذہن میں حارث کا غصہ کسی خاص فرد کی حیثیت سے سامنے نہیں آتا بلکہ ایک عام بدخو کے غصہ کی تصویر ہماری آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔

اس مرثیہ میں میر انیس کی مصوری اپنے کمال پر وہاں نظر آتی ہے جب وہ اس واقعہ کی تصویر کھینچتے ہیں جب حارث رات کے وقت جاگتا ہے اور حضرت مسلم کے صاحبزادوں کو اپنے گھر میں ڈھونڈھتا ہے۔

باقی تھی پہر رات کہ پھر ہوش اسے آیا ابلیس نے سوتے ہوئے فتنہ کو جگایا
پھولوں کی مہک حجرے سے دالان میں آئی
آواز بھی کچھ رونے کی پھر کان میں آئی

تاریک مثال دل کافر تھا وہ سب گھر ہر سو صفتِ گرگ لگا ڈھونڈھنے اُٹھ کر
ظالم نے سرہانے سے لیا ہاتھ میں خنجر پکڑے ہوئے دیوار گیا حجرہ کے اندر
واں مُسلم مظلوم کے پیارے نظر آئے
اک برج میں دو عرش کے تارے نظر آئے

پھر دوسری تصویر ان صاحبزادوں کی ہے جن کو یہ جراحت پہونچانے جا رہا ہے:-

جاگے جو کئی رات کے تھے وہ جگر افگار سوتے تھے دھرے پیار سے رخسار پہ رخسار
تصویر سے بستر پہ کشیدہ تھے تنِ زار بانہیں جو گلے میں تھیں تو بالیدۂ خونبار
اک سینہ کا تھا عکس جو اک سینہ کے اندر
آئینہ نظر آتا تھا آئینے کے اندر

بازو پہ جو چھوٹے کے پڑا دست جفا کار تو کون ہے وہ کہنے لگا چونک کے اک بار
جھنجھلا کے کہا اس نے کہ میں گھر کا ہوں مختار تب بھائی کو چونکا کے یہ بولا وہ دل افگار
جس بات کا دھڑکا تھا وہ آفت کی گھڑی ہے
کیا سوتے ہو اُٹھو کہ اجل سر پہ کھڑی ہے

حارث بچوں سے دریافت کرتا ہے کہ وہ کون ہیں اور جب اسکو معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت مسلم کے پسر ہیں تو تصویر ایک اور پہلو بدلتی ہے۔

سنتے ہی جفا کار نے بس آنکھ کو موڑا یوں بازوؤں کو زور سے پکڑا کہ نہ چھوڑا
بستی میں انھیں باندھ لیا عہد کو توڑا بچوں نے کئی بار بندھے ہاتھوں کو جوڑا
جب کھینچتا تھا گر کے مچلتے تھے وہ بچے
پھر حجرے کے باہر نہ نکلتے تھے وہ بچے

پھر وہ ان بچوں کو کشاں کشاں لے جاتا ہے۔ اس کی بیوی ان بچوں کو بچانے کی کوشش کرتی ہے اور اس کا جو حشر ہوتا ہے اس کی تصویر ملاحظہ ہو:-

جس وقت نمودار ہوئے صبح کے آثار دریا پہ چلائے کے یتیموں کو جفا کار
چلاتی چلی پیچھے ضعیفہ جگر افگار بن باپ کے بچے ہیں یہ ظالم نہ انھیں مار
کیوں فاطمہ زہرا کو رُلاتا ہے کفن میں
دو پھول تو رہنے دے محمد کے چمن میں

بچوں سے لپٹی تھی جو وہ کھولے ہوئے سر تلوار سے ہٹاتا تھا ستمگر
وہ کہتی تھی تو ان کے عوض قتل مجھے کر ہے ہے، مرے مہماں ہیں یہ بے کس و بے پر
آنکھوں سے قدم انکے لگانے نہیں پائی
کھانا بھی غریبوں کو کھلانے نہیں پائی

جس وقت ہٹانے پہ بھی لیٹی کئی باری تلوار اسے جھنجھلا کے ستمگار نے ماری
پہلے تو کہا لو میں تصدق ہوئی واری گرتے ہوئے ہاتھوں کو اٹھا کر یہ پکاری
دوڑے کوئی معصوم گرفتار بلا ہیں
بچوں کو چھڑا دے کہ یہ بے جرم و خطا ہیں

اس کے بعد وہ شقی بچوں کو نہر پر لاتا ہے :-

بچوں کو لئے نہر پہ پہونچا جو وہ بے پیر اور دیکھی یتیموں نے چمکتی ہوئی شمشیر
دل ہل گئے ہٹ ہٹ کے یہ کی دونوں نے تقریر کر رحم کہ معصوم ہیں ہم بیکس و دلگیر
مظلوم ہیں حامی کوئی مشکل میں نہیں ہے
ظالم نے کہا رحم مرے دل میں نہیں ہے

حارث کو کسی طرح رحم نہیں آتا ہے اور وہ دونوں بچوں کے مارنے پر طیار ہو جاتا ہے ——— اس وقت ان دونوں بھائیوں کی یہ کوشش کہ ان دونوں ساتھ مارے جائیں نہایت پر اثر ہے :-

نامرد نے حملہ کیا تلوار اٹھا کر سر رکھ دیا چھوٹے نے وہیں جلد بڑھا کر
تب ہاتھ سے چھوٹے کو بڑا بھائی ہٹا کر جا بیٹھا تہ تیغ دو دم سر کو جھکا کر
تلوار چمکتی تھی تو ہٹ جاتا تھا بھائی
پھر دوڑ کے بھائی سے لپٹ جاتا تھا بھائی

وہ شقی پہلے بڑے بھائی کا کام تمام کرتا ہے :-

ناگاہ چلی ظلم کی تلوار بڑے پر بالائے زمیں کٹ کے ستارا سا گرا سر
دریا میں ستمگار نے پھینکا سر اطہر چلا کے یہ چھوٹے نے کہا ہائے برادر
دیکھا جو بڑے بھائی کا سر دست عدو میں
وہ گر کے تڑپنے لگا بھائی کے لہو میں

پھر چھوٹے کو قتل کر دیتا ہے :-

آیا جو شقی تیغ علم کر کے دوبارا — چلانے لگا بھائی کو وہ بھائی کا پیارا
مادر کو پکارا کبھی بابا کو پکارا — جلادنے تن پر سے سر اس کا بھی اُتارا

دھبّا بھی نہ خوں کا لگا شمشیر عدو میں
بھائی کا لہو مل گیا بھائی کے لہو میں

ان دونوں بھائیوں کی لاشیں جو دریا میں ڈال دیجاتی ہیں ان کی تصویر یہ ہے :-

جب تک کہ تڑپتا رہا اس کا تن لاغر — ٹھہرا رہا پانی پہ بڑے کا تنِ اطہر
چھوٹے کو بھی جب ڈال دیا نہر کے اندر — جا لپٹا بصد شوق برادر سے برادر

گہ ڈوبتے تھے گاہ اُبھر آتے تھے دونوں
خورشید سے دریا میں نظر آتے تھے دونوں

یہ پورا مرثیہ مسلسل تصویر کشی کے لحاظ سے بڑی مکمل چیز ہے۔ دوسرے مرثیوں میں بھی ایسی مکمل تصویریں ملتی ہیں ——— مگر ان میں رسوم مدح، رزم و بزم اور گھوڑے اور تلوار کی تعریفوں میں اُلجھ کر شاعر مسلسل تصویر کشی کے حدود سے گزر جاتا ہے۔

(۴) **احتساسی رجحان** :- ان تصویروں کو سامنے رکھ کر ہم میر انیس کی ان شاعرانہ قوتوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو فطرت نے ان کو ودیعت کی تھیں۔ ہر بڑے شاعر میں بعض خاص قسم کی قوتیں ہوتی ہیں اور ان ہی قوتوں سے اپنا فن پیدا کرتا ہے۔ میر انیس کا دماغی رجحان خاص طور پر احتساسی تاثرات (Sensuous Impression) کی طرف تھا جسکی طرف لوگوں کی بہت کم نگاہ گئی ہے۔

یونتو ہر شخص کو قدرت نے حسیات دئے ہیں، لیکن شاعر کی فطرت میں ان حسیات کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ یہ عام آدمی سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ یعنی شاعر کو ہر چیز کی زیادہ حس ہوتی ہے اور وہ اپنے حسیاتی تاثرات کو زبان کے ذریعہ اسی طرح پیش کر سکتا ہے جیسے کوئی مصور رنگوں کے ذریعہ پیش کرے اور میر انیس میں یہ احساس بہت قوی تھا۔

میر انیس کی حیات اور ان کے تمام زندگی کے رجحانات کا ہم کو کوئی علم نہیں ہے اس لئے ان کی نفسیاتی صورتوں کا جایزہ لیتے وقت ہم کو تمامتر مرثیوں پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔

یوں تو میر انیس کی تصویروں میں تمام حسیات نہایت زوردار ہیں مگر سب سے زیادہ زور حسیات بصری (Visual Impression) پر ہے۔ ان کی تصویروں میں وہ جزئیات سب سے زیادہ پر اثر ہیں جو قوت

باصرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

مثلاً :۔

اک گھٹا چھا گئی ڈھالوں سے سیہ کاروں کی
برقی ہر صف میں چمکنے لگی تلواروں کی
گردوں پہ رنگِ چہرۂ مہتاب فق ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

رنگوں کے لئے وہ خاص آنکھیں لیکر پیدا ہوئے تھے، ان کی کوئی تصویر ایسی نہ ملے گی جس میں رنگوں کا ذکر نہ ہو۔ ان کے رنگوں کے استعمال پر پورا ایک مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ افراد کے بیان میں کپڑوں کے رنگ۔ چہروں کی رنگت عضہ میں آنکھوں کے رنگ وغیرہ کا خاص ذکر ہوتا ہے۔ مناظر قدرت کے سلسلہ میں یہ رنگ خاص لطف رکھتے ہیں مثلاً :۔

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح
تھا چرخ اخضری پہ وہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا
پھولوں کے سبز سبز شجر سُرخ پوش تھے
خزاں کا رنگ اُڑاتے تھے زعفرانی پھول

KHUDA BAKHSH ORIENTAL PUBLIC LIBRARY
کتب خانہ
انجمن ترقی اردو
(ہند)
علیگڑھ
ALIGARH

حرکتوں کی تیزی کو بھی میر انیس کی قوتِ باصرہ نہایت عمدہ طریقہ پر پیش کرتی ہے۔ محرک تصویروں کے سلسلہ میں جو مثالیں ہم نے دی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حرکت کا احساس میر انیس بہت حسن و خوبی سے پیش کر سکتے ہیں۔

خط و خال کے ذریعہ سے تصویر میں جان ڈالنا بھی مصوری کا ایک خاص فن ہے اور میر انیس کی تصویروں میں باریک ہلکے، گہرے سیدھے اور خم دار خطوط نہایت مکمل نظر آتے ہیں۔

مثلاً :۔ سجدوں کے چمکتے ہیں نشاں صورتِ اختر

یا :۔ ہلتے ہیں ستاروں کی طرح کانوں کے گوہر

یا حضرت علی اصغر کے کرتے کا بیان :۔

کرتا بدن پہ آتا تھا اس رنگ سے نظر
پڑتی ہے اوس پھولوں پہ جیسے دمِ سحر

نفسیاتی حالات کی بابت بھی میر انیس ان جزئیات پر زیادہ توجہ دیتے ہیں جو آنکھوں سے دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً کسی کو غیظ میں دکھانا ہے تو آنکھوں کی سرخی کی طرف اشارہ کرینگے اس قسم کی بہت مثالیں ہم دے چکے ہیں۔

مکتوباتِ نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاستِ بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فنِ انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں، اور جنکے سامنے خطوطِ غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، ان اڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا گیا ہے اور ۲۶ پونڈ کاغذ پر طباعت ہوئی ہے۔ قیمت حصہ اول و دوم فی حصہ تین روپیہ، حصہ سوم چار روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخئیل اس کی نزاکتِ بیان اس کی بلندیِ مضمون اور اسکی انشاءِ عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

جذباتِ بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:-

۱- چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲- مادیئن کا مذہب۔

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت:-

ایک روپیہ

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک اجمال میں موجود ہیں، یہ فنا اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط سرورق رنگین۔

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانیکے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیانِ طریقت و علماء کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور اس کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے زبان، پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

مذاکراتِ نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایکبار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے

قیمت:-

ایک روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول

انتقادیات (دو حصے)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات دو حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں، پہلے حصہ میں وہ مقالات ہیں جن میں خاص شعراء کے کلام پر تنقید کی گئی ہے مثلاً مومن، ظفر، غالب، مصحفی، نظیر، سیماب، جوش، اصغر وغیرہ وغیرہ دوسرے حصہ میں عام ادبی و انتقادی مباحث ہیں جنکا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے

قیمت حصۂ اول للہ حصۂ دوم علاوہ

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔

اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنے رکھتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری سنہ ۳۹ء

(مصحفی نمبر)

اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:- حیاتِ مصحفی - اُردو غزلگوئی میں مصحفی کا مرتبہ - مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں، انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ

قیمت دو روپیہ، علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۰ء

(نظیر نمبر)

اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:- نظیر کا مسلک - شاعری پر تبصرہ - نظیر اور عوام - انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ -

قیمت دو روپیہ، علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی -

قیمت ایک روپیہ، علاوہ محصول

جنوری فروری، مارچ سنہ ۴۶ء

یہ سالنامہ دو حصوں میں شایع ہوا ہے اور فنِ انتقاد پر ملک کے بہترین اہلِ قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے پہلا حصہ جنوری کا ہے اور دوسرے حصہ میں فروری، مارچ دونوں نمبر شامل ہیں

قیمت ہر حصہ کی ایک روپیہ، علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۷ء

اس سالنامہ کا نام "ماجد دریابادی نمبر" ہے جس میں ایک بیمثل خراجسینی ادیب کی ایک شاہکار ٹریجڈی کو اُردو میں منتقل کیا گیا ہے - ادبیت و جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا -

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور رس اور اُن کارناموں کو نہ بھولجائے جنپر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قایم ہوئی تھی - قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شایع کئے گئے ہیں - اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اسکے مطالعہ سے بہ آسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری فسانہ کیسا ہونا چاہیے - قیمت دو روپیہ - علاوہ محصول

نرخنامہ اُجرت اشتہار

ایک سال	چھ ماہ	تین ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ ۶۰۰ روپیہ	۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۵۰ روپیہ
آدھ صفحہ ۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۲۵ روپیہ
چوتھائی صفحہ ۱۵۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۴۰ روپیہ	۱۴ روپیہ

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر چھ روپیہ - ششماہی جاری نہیں ہو سکتا - سالانہ بیرونِ ہند بارہ روپیہ

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۰ ار تاریخ تک شایع ہوتا ہے اور ۱۵ ار تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے، ورنہ پھر کسی طرح نہیں مل سکتا - "منیجر"

کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات اور قواعد و طلب کیجئے "منیجر"

جواب کیلئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے